

ایکشن سے بھرپور سنسنی خیز ناول

دُشمن

ایم الیاس



میرے ساتھ کچھ دن سے ایسے واقعات ہو رہے تھے کہ میں اسے محض اتفاقات قرار نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا، میں تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں کوئی دولت مند آدمی نہیں ہوں۔ سیاسی لیڈر نہیں ہوں۔ میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے۔ کسی رشتے دار سے جائیداد کا جھگڑا نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کسی کے خلاف عدالت میں کوئی گواہی دی ہے۔ میں ملازمت کر کے اپنی زندگی گزار رہا ہوں۔ دفتر، ہوٹل، گھر اور مطالعہ یہ میری زندگی کے محور تھے۔ مجھے کچھ ایسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی میری جان کا دشمن ہو گیا ہے، پھر بھی میں نے اسے اپنا دواہمہ سمجھ کر ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش کی تھی۔

کوئی دس بارہ دن پہلے کی بات ہے کہ میں ایک سنسنی خیز جاسوسی ناول رات دیر تک پڑھتا رہا وہ اس قدر دلچسپ تھا کہ میں اسے ختم کئے بغیر نہیں رہا۔ میں نے بستر پر لیٹنے سے پہلے بتی بجھائی اور ارادی طور پر پردہ ہٹا کر باہر جھانکا باہر ایک گرم سیاہ سلساں رات کا اندھیرا تھا۔ بادل یوں برس رہے تھے کہ جیسے مرگب ناگماں پر رونے والوں کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ سامنے والے گھر کے برآمدے میں اندھیرے میں ایک شخص پراسرار انداز سے کھڑا تھا اگر وہ اپنا سرگٹ نہیں جلاتا تو مجھے اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ایک دراز قد اور مضبوط جسم کا شخص تھا۔ دیا سلائی کی روشنی میں، میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو میرے سارے بدن پر سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کسی پیشہ ور قاتل کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی پردہ چھوڑ دیا، یہ شخص کس لئے یہاں کھڑا ہے؟ میں

ہو۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ویسے وہ ایسی لڑکی دکھائی نہیں دیتی تھی کہ اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کی جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے اٹھ گیا کیس میرے کسی جاننے والے نے مجھے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا تھا وہ اپنے دل میں میرے بارے میں کیا سوچے گا؟ میرے دفتر کے لوگ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اکثر میل آتے رہتے تھے۔ چونکہ میرے پاس خلافت تھا اور میری جیب میں چوبیس کے شو کا ٹکٹ تھا، میں مڑگٹ کرنے لگا۔ میں نے تھوڑی دیر کے بعد محسوس کیا کہ وہ نوجوان لڑکی غیر محسوس انداز سے میرے تعاقب میں ہے۔ معلوم نہیں کس لئے میرے تعاقب میں تھی۔ میں اس فحاشی کا آدمی نہیں تھا۔ میں نے کبھی کسی عورت کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جب سے بے روزگاری، مزدگانی اور ملک کی معاشی بد حالی میں اضافہ ہوا تھا تب سے بدکاری میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کوئی چوبیس تک وہ میرے تعاقب میں رہی اس عرصے میں اس نے ایک بار بھی میرے پاس آنے یا مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس نے ایک لمبے بھی مجھے اپنی نگاہوں کی گرفت سے نہیں نکلنے دیا تھا۔ آخر وہ کیا چاہتی تھی؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک پراسراری لڑکی تھی اس کی حرکات و سکنات بھی پراسراری تھیں۔

میں نے ٹھیک پونے چوبیس رنمارگرین پارک سے باہر آ کر ایک آئور کھالیا اور مدعو تینیا پہنچا۔ وہاں ایک رومانی اور جذباتی فلم لگی ہوئی تھی۔ اس کا ٹکٹ میں نے پہلے ہی سے بک کر لیا تھا، فلم بہت ریش لے رہی تھی، میں جیسے ہی اندر جا کر بیٹھا سینما ہل میں اندھیرا چھا گیا اور فلم شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے دائیں جانب جو خالی سیٹ تھی اس پر کوئی آکر بیٹھ گیا۔ شاید کوئی عورت تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اطمینان سے فلم دیکھتا رہا۔ البتہ میں بائیں جانب سمٹ گیا تھا تاکہ نادائستگی میں میرا بازو اس کے جسم سے مس نہ ہو جائے۔

نے سوچا شاید ذہنی یا کسی اور ارادے سے کھڑا ہو۔ اس گلی میں چوہدری ابو القاسم کا مکان تھا۔ وہ اس محلے کا سب سے امیر ترین شخص تھا۔ اس بات کا امکان تھا وہ اس کے پاس چوری کے ارادے سے آیا ہو۔ میں نے سوچا کہ اس چور بد معاش کو کس طرح چوری کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔ میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے گلی میں قدموں کی آوازیں سنیں۔ میں نے کھڑکی کے پاس جا کر پردے کو اٹھا کر دیکھا کہ ایک بھری سی بن گئی۔ اس بھری میں سے جھانکا اُسے آسمان پر بڑے زور سے بجلی چمکی تھی۔ اس روشنی میں، میں نے ایک اور بد معاش کو اس کے پاس کھڑے دیکھا۔ وہ اپنی جیب سے چاقو نکال کر میرے مکان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

میں کوئی بزدل یا ڈرپوک شخص نہیں تھا میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے میں ان دو خطرناک اور مسلح بد معاشوں سے مقابلہ کر سکوں۔ تاہم میں نے باور پچی خانے میں جا کر ہزنی کاٹنے والی چھری اٹھائی اور کمرے میں جلی جلا دی تاکہ انہیں یہ خبر ہو کہ میں جاگ رہا ہوں۔ اس رات کوئی واقعہ پیش نہیں آیا لیکن میں نے ساری رات آنکھوں پر کلائی۔

اس کے دوسرے دن میں اس ہوٹل میں رات کا کھانا کھا رہا تھا جو میرے محلے میں تھا کھانا کھاتے ہوئے میری نگاہ مخالف سمت کے کوٹے والی میز پر پڑی، یہ شخص بھی اپنی وضع قطع اور چہرے میرے سے بد معاش لگ رہا تھا مجھے اپنی لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے ختم کے بغیر نہیں رہے گا۔

اتوار کے روز میں سہ پہر کے وقت حسب معمول رنمارگرین پارک گیا میں شام چار بجے سے چوبیس تک وہاں وقت گزار رہا تھا۔ میں ایک خلی شیخ پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی جو ساڑھی میں لمبوس تھی، جس کی پیشانی پر بندا لگی تھی اور اس نے اپنے بالوں کے جوڑے میں پھول لگا رکھا تھا شیخ پر مجھ سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔ لڑکی حسین بھی تھی اور پُرکشش بھی۔ اس نے میری طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا جیسے وہ شہنا

ہلے یہ محسوس ہوتا تھا کہ دشمن کہیں آس پاس ہی چھپا ہوا ہے۔

میں چھٹی والے دن صدر رکھٹ سے کشتی میں زنجیرو جانے کے لئے ٹرینل پر پہنچا اتفاق سے اس وقت کوئی کشتی زنجیرو نہیں جاری تھی کیونکہ پانی میں سورج کی تپش کی وجہ سے بڑی طغیانی تھی مویں پھری ہوئی تھیں لیکن لانچوں اور سینروں کی آمدورفت جاری تھی ایسی صورت میں کشتی میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے میں لانچ پر سوار ہو گیا اور عرش پر رینگ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میری پشت پر دس بارہ مسافر کھڑے ہوئے تھے، بمشکل دس بارہ منٹ کا سفر تھا، میں قدرتی مناظر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ جس وقت کشتی بوڑھی لنگہ کے درمیان میں سے گزر رہی تھی مجھے اچانک کسی نے پیچھے سے ایسا زبردست دھکایا کہ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ میں پانی میں جا کر جب میں فوطہ مار کر ابھرا تو میں نے عرش پر اس لڑکی کی جھلک دیکھی جو مجھے رنار گریں پارک میں ملی تھی۔ اس کے ساتھ وہی آدمی کھڑا تھا جسے میں اس کے ہمراہ سینما ہاؤس میں دیکھ چکا تھا، لانچ تیزی سے جاری تھی اس لئے فوراً رک نہ سکی۔ البتہ مخالف سمت سے آتی ہوئی بڑی کشتی میرے پاس آ کر رک گئی تھی اس کے ملاح اور مسافروں نے مجھے سلاما دے کر کشتی میں سوار کیا۔

میں نے اس رات بہت سوچ بچار کیا کہ آخر میرا کون دشمن ہے جو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے جبکہ میں ایک معمولی آدمی ہوں، دفتر میں میری کسی سے بھی کوئی پتلا نہیں تھی، نہ ہی میں کسی کی ترقی میں رکھتا تھا۔ نہ میرے پاس کوئی ایسا بڑا اعمدہ تھا کہ مجھے مل کر کوئی خود اس عمدے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے مگر میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مخمے کو حل کرنے کے لئے کسی کی مدد لوں؟ اس شیطانی پکر نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا مگر میں نے ایک دو دن کے بعد اپنے اس خوف پر قابو پایا تاہم میں چوکنا ہو گیا تھا، بے حد محتاط رہنے لگا تھا چوک چوک کر قدم رکھتا تھا

جب انٹرول ہوا تو میرے دائیں جانب بیٹھی ہوئی لڑکی کی شکل دیکھ کر میں بڑی طرح چوک پڑا وہی لڑکی تھی جو پارک میں ملی تھی اور میرے تعاقب میں تھی، مجھے ایک مظلوم سے خطرے کا احساس ہوا کیونکہ اس کے ساتھ ایک شخص بھی تھا۔ لڑکی نے مظلوم نہیں اس سے کیا کھسکھس کر کہہ دیا کہ مجھے خشک نظروں سے گھورنے لگا تھا۔ میں نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ میں اس سے کھسکوں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لڑکی مجھ پر کوئی الزام عائد کر کے کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے۔ اس کے ہمراہ جو شخص تھا وہ مجھے اچھا آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں ایک روز دفتر سے نکل کر فٹ پاتھ پر آیا، سڑک پار کرنے کے ارادے سے کھڑا ہو گیا جیسے ہی سگنل بند ہوا اور سیلاب کی طرح بہتا ہوا ٹریفک رک گیا تو میں فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پار کرنے کی کوشش کرنے لگا، کیونکہ بھوم بہت تھا۔ میں سب سے پیچھے تھا ایک سخت مخالف سمت سے ایک موٹر سائیکل سوار سگنل توڑتا ہوا میری طرف اس قدر تیز رفتاری سے آیا کہ میں بے آگے نہ دیکھا ہوتا اور میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ نہ ہوتا تو میں یقیناً اس کی زد میں آ جاتا۔ اس نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے کسی چیز سے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں ہٹ نہ جاتا تو وہ چیز میرے جسم کے کسی بھی حصے پر لگ جاتی۔ پھر وہ چیز اس کے ہاتھ سے نکل کر سڑک پر گر پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو میری آنکھیں خوف سے پھیل گئیں وہ ایک خوفناک قسم کا خنجر تھا۔

اب میرے لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ کوئی ناپیدہ دشمن میری موت کا خواہاں ہے اور میری زندگی کا چراغ گل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ میں جب بھی کہیں جاتا تھا یا اپنے گھر میں ہوتا تھا تو ہر طرف ناپیدہ دشمن کی آنکھیں مجھے گھورتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ میری تنہائی اور گھر کی خوشی، مگر وہی بن جاتی تھی اور اس کی بازگشت ہر سمت سے پکارتی تھی کہ موت میرے گرد اپنا حصار تنگ کر رہی ہے۔

آج میں نہ جانے کیسے اس کی نظروں میں اس قدر اہم ہو گیا تھا۔ اس کا دم حجم لہجہ پھوار بن کر مجھ پر برساتا رہا۔ میں اس کی مدھر آواز میں ڈھٹتا چلا گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ زیب النساء کے انداز میں اس قدر اداانہ پن اور دار و فکلی محسوس کی تھی۔ اس کی مست انگلیوں نے میرے سینے میں خوبیدہ انگلیوں کو چکا دیا تھا۔

جب ہم رستوران سے باہر آئے تو شام کا دھندلکا رات کی سیاہی میں تحلیل ہو چکا تھا۔ یہ شام کیسی حسین سی لگ رہی تھی، اس نے اپنی گاڑی کے پاس رک کر مجھ سے پوچھا۔ ”آپ گھر جا رہے ہیں یا کہیں اور؟“

”گھر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے آوارہ گردی ذرا بھی پسند نہیں۔“

”آپ کیسے جائیں گے؟“

”بس یا رکشا سے چلا جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہیڈل بھی جاسکتا ہوں“ میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”چلے میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں اس طرح آپ کا گھر بھی دیکھ لوں گی۔“

میں نے رکی طور پر ذرا تکلف سے کام لیا لیکن اس کے اصرار پر اس کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کم از کم اس طرح مزہ کچھ محلات اس قیامت کے قرب میں گزارے جاسکتے تھے، میں اس سے محروم رہنا چاہتا تھا۔

میں نے زیب النساء کو اپنے گھر کا پتہ بتا دیا تھا مگر کم بازار کے علاقے سے گزرتے ہوئے اس نے بیکاپ اپنی گاڑی کا رخ ایک سنسان لمبی اور پتلی سی گلی میں موڑ دیا۔ یہ راستہ میرے گھر کو نہیں جاتا تھا۔

”یہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”یہ آپ غلط راستے پر آگئی ہیں۔“

”یہ سمجھئے کہ آپ کو انورا کر کے لے جا رہی ہوں۔“ وہ خوشی سے یوں ہنس پڑی۔ اس کے گداز ہو نہوں پر مکرر امٹ گری ہو گئی۔ ”یہ بھی ایک حسین اتفاق ہے کہ ادھر

سے گزرتے وقت میرا غریب خانہ پہلے آگیا، گھر کا راستہ دیکھ کر مجھے فوراً یاد آیا کہ میرا چھوٹا بھائی آج صبح چٹانگ سے لوٹنے ہوئے تازہ روپ چندا چھپی لے کر آیا تھا۔ میری چھوٹی بہن شیدا، چھپی اس قدر لذت بخاتی ہے کہ آپ نے شاید یہ کبھی ایسی فریٹی چھپی کھائی ہوگی، دال اور بھات کے ساتھ اس کا لطف دوہلا ہو جاتا ہے۔“ چند منٹوں کے وقف کے بعد اس نے اپنی مٹھنگو کا سلسلہ جوڑا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ رات کا کھانا میرے ساتھ کھاتے ہوئے کوئی تکلف محسوس نہیں کریں گے۔“

زیب النساء زہر کھلانے کے لئے مدعو کرتی تھیں یہ خوشی اس کی دعوت قبول کر لیتا۔ میں نے ذرا بھی تامل نہیں کیا بلکہ کسی قدر بے تکلفی سے اپنا اشتیاق ظاہر کیا، ایسا مرد جو ہوٹلوں اور اپنے ہاتھ کے کپے ہوئے کھانے کا ذائقہ زبان سے زہر کی طرح محسوس کرتا ہو وہ گھر میں پکائے ہوئے کھانوں سے کیسے موزوں ہو سکتا ہے۔

زیب النساء نے کھانے کی سیر پر خود تو بہت کم کھلیا مگر مجھے بڑے چاؤ اور اصرار سے کھلاتی رہی۔ میں نے اس کی طرف جتنی مرتبہ بھی دیکھا، اتنی ہی بار یہ سوچا کہ زیب النساء آج مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہو رہی ہے اگر اسے میری وجاہت نے متاثر کیا ہے تو اسے بہت پہلے میری طرف پیش قدمی کرنا چاہئے تھی، آج آخر کیا ہوا؟

کھانے سے فراغت کے بعد اس کی چھوٹی بہن شیدا نے میرے لئے تازہ لیموں کا شربت بنایا۔ زیب النساء نے اپنے لئے چائے بنوائی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اس کے گھر کے خوشگوار ماحول میں بیٹھا لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ سب لوگ مجھ سے اس طرح بے تکلف ہو گئے تھے جیسے میں اس گھر کا ایک فرد ہوں۔ رات کے گیارہ بجے ان لوگوں نے مجھے جانے کی اجازت دی۔ میرے انکار کے باوجود زیب النساء کا چھوٹا بھائی مجھے اپنی لار میں گھر تک پہنچانے آیا تھا۔

کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے جب میں بستر پر لیٹا تو احساس ہوا کہ عورت کے بغیر گھر اس قدر شونہا شونسا لگتا ہے اور زندگی بھی کتنی بے رنگ و بے کیف اور ادھوری محسوس

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ دفتر والوں نے اچھی طرح سے اطمینان کر لیا ہے۔“

”پھر چور کس لئے آیا تھا؟“

اس شخص نے لاعلمی کے انداز میں اپنے کانڈے اچکائے۔ ”ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ کوئی چیز نہ لگ سکی ہو اور وہ نامراد واپس چلا گیا ہو۔“

میں اپنے کمرے میں پہنچ کر سانس بھی لینے نہیں پایا تھا کہ پاس کی سیکورٹی مس شوہانے مجھے اسٹرکام پر پاس کا یہ حکم سنایا کہ میں پانچ لاکھ کی رقم لے کر فوراً پاس کے پاس پہنچوں۔ معاملہ چونکہ طے نہیں ہو سکا ہے اس لئے وہ پابندی رقم واپس لینے آئی ہے اور بڑی دیر سے میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔

میں نے جیسے ہی چابیاں نکال کر تجوری کھولی دوسرے ہی لمحے میں آنکھیں دھندلا سی گئیں اور دل کی دھڑکنیں یک لخت رک گئیں، میں سنانے کے عالم میں اپنی جگہ اس طرح سے جمجھکیا ہوا جیسے کوئی بجلی آگری ہو۔ میں نے اپنی آنکھیں مل کر اپنے سامنے چمائی ہوئی دھندلانے کی کوشش کی، تجوری خالی تھی اور میرا تھوڑا سی تھی۔ چری بیک کے ساتھ ساتھ دفتر کی دس ہزار کی رقم بھی غائب تھی۔ صرف ضروری کاغذات اپنی جگہ موجود تھے۔

پھر میرا سر تیزی سے پکڑنے لگا کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ رفتہ رفتہ میرا ذہن تانکیوں میں ڈھنسا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو پاس کے کمرے میں صوفے پر لیٹا ہوا پایا۔ میں سختی درجے ہوش رہا تھا اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ ہو سکا تاہم حیرت کی بات یہ تھی کہ میں اس قدر مضبوط اعصاب کا مالک ہے ہوش کیسے ہو گیا تھا۔

کمرے میں میرے علاوہ چار افراد اور تھے۔ سب سے پہلے میری نظر پاس اور زیب النساء پر پڑی پاس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سہل نظر آ رہا تھا لیکن زیب

ہوئی ہے۔ آج مجھے اپنی زندگی میں بہت بڑا خلاء محسوس ہو رہا تھا۔ میں زیب النساء کے بارے میں سوچنے لگا اس کا قرب کس قدر خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ اس کا ادا سناہ انداز اس کا شوق، لہجہ، دل کو گرمادینے والی دلکش مسکراہٹ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے مجھے غور کی غباری ہونے لگی، خواب میں بھی میں زیب النساء کے سبک ان دیکھے نظمتوں اور رنگ برنگ پتلوار یوں کی سیر کرتا رہا۔

مجھ میری آنکھ کچھ دل تو دن خاصا مل گیا تھا۔ مجھے نو بجے دفتر پہنچنا ہوتا تھا یہ میری زندگی کا شاید پہلا اتفاق تھا کہ جو اس قدر دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ میرے سارے وجود پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا جس نے مجھے جلد بیدار ہونے نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ آج دفتر گول کر دوں اور زیب النساء کا سنہرہ پستان دیکھوں لیکن جیسے ہی مجھے چابیوں کا خیال آیا میرا نشہ ہرن ہو گیا۔ میں جلدی جلدی تیار ہوا اور جب میں بھاگ بھاگ دفتر پہنچا تو ٹیبلر، بیچ پک تھے۔

دفتر میں قدم رکھتے ہی مجھے وہاں کی فضا کچھ بدلی بدلی سی نظر آئی، دفتر کے بیرونی دروازے پر پولیس کے چند سپاہیوں کو مستعد دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھک گیا تھا۔ دفتر کے لوگ آہیں میں چہ بیگو نیل اور سرگوشیاں کر رہے تھے، ”تذکیاں سہمی اور گھبراہٹ ہوئی سی تھیں“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

میرے دریافت کرنے پر دفتر کے ایک شخص نے بتایا کہ رات کے وقت کسی ماحولم چور نے چوکیدار کو شدید زخمی کر دیا ہے اس کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا ہے جہاں اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کی جارہی ہیں، یہ ابھی تک نہیں معلوم ہو سکا کہ اسے کس چیز کی ضرب سے بے ہوش کیا گیا ہے۔

ایک انجانے خوف سے میرا دل دھڑک اٹھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تجوری کھولنا آسان نہیں ہے اور اس کی چابیاں میرے پاس ہیں پھر بھی میں نے سراپہ ہو چھا کیا دفتر میں چوری ہوئی ہے؟

آپ اس بات کا بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ساری شہادتیں آپ کے خلاف جاری ہیں اور وہ سب کی سب اس قدر نفوس ہیں کہ آپ اپنے جرم سے دامن بچا نہیں سکتے۔ آپ کے پاس اور مس زینب النساء اس امر کے گواہ ہیں اور آپ بھی یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ تجوری کی چابیاں آپ کے پاس موجود تھیں۔ دفتر پنچ کر آپ نے تجوری دیکھی کوئی تو وہ اسی طرح قفل تھی۔ چوکیدار نے ہوش میں آکر یہ بیان دیا ہے کہ رات کے وقت آپ دفتر کے عقبی حصے سے داخل ہوئے اور بیوی نہ دروازے سے چوری ٹیک لے کر نکل رہے تھے کہ اس کا آپ کا آمتنا سامنا ہو گیا“ آپ نے اسے دیکھتے ہی اس پر حملہ کر دیا۔ اپنی دانت میں تو آپ نے چوکیدار کو قتل کر دیا لیکن قدرت نے اسے بچا لیا۔ یہ دوسرا سنگین جرم ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان تمام شواہد کے باوجود آپ کو ایک شرط پر معاف کیا جاسکتا ہے۔“

میں نے پھرانی ہوئی آنکھوں سے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا اس مردود چوکیدار نے میرے خلاف قطعاً جھوٹا بیان دیا تھا۔ میں نے مردہ لہجے میں پوچھا۔ ”کس شرط پر؟“

”آپ وہ رقم واپس کر دیں۔“ اس نے تیز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

میرے چہرے کا رنگ خستہ ہو گیا“ میں نے ذوق ہوئی آواز میں کہا۔ ”میرے پاس وہ رقم کہاں سے آسکتی ہے؟ جبکہ میں نے چوری نہیں کی۔“

”آپ انتہائی دھڑلئی سے ان ساری شہادتوں کو بھٹا رہے ہیں؟ بڑے افسوس اور شرم کی بات ہے۔“ پولیس انسپکٹر نے مجھے لامت سے کہا۔ ”چوکیدار کا بیان.....“

”چوکیدار کا بیان سراسر کواس ہے۔ مجھ پرستان ہے۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”چیتنے چلائے سے کوئی قاعدہ نہیں ہو گا سزا“ انسپکٹر نے سختی سے کہا۔ ”آپ قانون کی نظروں میں مجرم بن چکے ہیں۔ چوکیدار اس واقعہ کا مبینہ گواہ ہے۔ آپ اس کے

النساء کسی قدر فکرمند اور مضطرب دکھائی دی۔ اس کے چہرے کی شادابیاں ماند پڑ گئی تھیں اور آنکھوں کے چراغ بجے بجے سے نظر آ رہے تھے۔ اسے تردد کا شکار دیکھ کر میرے دل پر جوش لگی میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر تیسرے شخص کی طرف دیکھا یہ وہ شخص تھا جو کل پانچ لاکھ روپے لے کر آیا تھا اور آج وہ رقم مجھ پر ایک عذاب بن کر نازل ہو گئی تھی۔ میں گردن تک دلدل میں بھنس چکا تھا۔ وہ شخص کمرے میں موجود لوگوں میں سب سے زیادہ مضطرب اور ہوتن دکھائی دیا۔ چوٹا چہرہ میرے لئے قطعی اجنبی تھا اس کی وردی اس کے پیشے کو متعارف کر رہی تھی وہ پولیس انسپکٹر تھا اس کے چہرے پر بے بسی اور آنکھوں میں سختی جھلک رہی تھی۔ مجھے ہوش میں آنا دیکھ کر وہ تیزی سے لپک کر میری طرف بڑھا باقی تینوں بھی اس کی تقلید میں میری جانب دوڑ پڑے۔ میں ان لوگوں کو اپنی طرف آنا دیکھ کر ہڑا کر اٹھ بیٹھا کچھ دیر پہلے کا واقعہ یاد آتی ہی خوف کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔

پولیس انسپکٹر کسی قدر بے رحم اور سفاک شخص دکھائی دیتا تھا“ اس نے نہایت جارحانہ انداز سے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی جیسے میں کوئی خطرناک ترین مجرم ہوں اس کی زبان سے نکلتا ہوا ایک ایک لفظ دو دھاری تلوار کی طرح میرے سینے میں اترتا تھا۔ اگر وہ میرے بدن پر بے دردی سے کوڑے برساتا تو شاید مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس کے سوالات سے ہو رہی تھی۔ مجھے ان سب کی نظروں میں ذلیل کیا جا رہا تھا تاہم میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور اس کے ہر سوال کا جواب قطعی بخش انداز میں جواب دینے کی کوشش کی لیکن وہ میرے کسی جواب جیسے مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے چند لمحات کے توقف کے بعد جیسے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”دیکھئے سزا“ آپ فوج میں ایک اہم افسر رہ چکے ہیں“ آپ کے پاس نہیں چاہتے کہ یہ واقعہ پولیس کس بن جائے“ میں اس ضمن میں صرف اس لئے رعایت دے رہا ہوں کہ فوج کا تقدس مجروح نہ ہو۔ عوام اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر کس قسم کی رائے قائم کریں گے

اس کے علاوہ میرے لئے چھٹکارے کا کوئی اور راستہ بھی تو نہیں تھا۔

☆-----☆

اس دن اور پھر رات بھر سوچ سوچ کر میرا دل غل ہو گیا لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آ سکا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ کسی نے میرے خلاف سازش کر کے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن مجھے پھنسا کر آخر اسے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ میں دفتر کے کسی شخص کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بناتا کسی کو مجھ سے ایسی کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ مجھے کوئی دیا شخص نظر نہیں آیا جس پر شک کر سکتا۔ جس کسی نے بھی مجھے پھنسانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے بے امتیاز ہانت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ شخص چاہتا تو ساری رقم ہرپ کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف مجھے ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ میرے دامن پر رسوائی اور بدنامی کا داغ لگانا چاہتا تھا لیکن آخر کیوں؟ اس سے اس کا کیا مقصد تھا وہ کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟

سوچتے سوچتے میرا داغ پکرا گیا۔ بے شمار سوالات تھے جو میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے لیکن میرے پاس کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں گھپ اندھیرے میں کھڑا تھا۔

میں کئی دنوں تک اس جانکاہ صدمے سے اس قدر دل گرفتہ رہا کہ کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ مجھے باہر نکل کر کرنا بھی کیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں میرا کوئی دوست، 'مونس اور فلم خاں نہیں تھا، کتنی کے چند شناسا لوگ تھے جن سے میرے تعلقات رکھی سے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی میرا درد و دل بانٹ نہیں سکتا تھا کوئی میرے دامن سے بدنامی کا داغ دھو نہیں سکتا تھا، ان دنوں بستر پر لیٹے لیٹے جھٹ گھورتا رہتا، آپ ہی آپ باتیں کرنے لگ جاتا۔ میرے ذہن میں اس واقعے سے جو شبہات ابھرتے رہتے ان پر گھنٹوں غور کرتا، میں ان تمام کڑیوں کو ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کرتا جن کا کوئی سراہی نہیں تھا۔

بیان کو کسی بھی عدالت میں جھٹلا نہیں سکتے اور نہ ہی جیل جانے سے بچ سکتے ہیں۔
"یہ میرے خلاف کوئی تھمڈائی سازش معلوم ہوتی ہے۔" مجھے اپنی آواز دیران کھوکھلی اور بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

اس وقت زیب اتسائے جھر جھراتی آواز میں پولیس انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ "کیوں نہ آپ ان کے گھر کی تلاشی لے لیں۔"

پولیس انسپکٹر نے ہل بھر کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ کتنی ہیں تو چل کر ان کے گھر کی تلاشی لے لیتا ہوں لیکن کوئی احمق شخص بھی اتنی بڑی رقم چرانے کے بعد اپنے گھر میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔"

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "کیا ہم آپ کے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں؟" اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ہے۔" میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں..... چلتے۔"

میں ان چاروں کو اپنے ہمراہ لے کر گھر پہنچا، انسپکٹر نے ان سب کے سامنے میرے گھر کی تلاشی لینا شروع کی، میرے کمرے میں سلمان ہی کیا تھا۔ میں تو ایک مسافر کی طرح رہ رہا تھا، تلاشی کے دوران میرا سوٹ کیس بھی کھلوایا گیا اور اس میں وہ چری بیگ برآمد ہوا جس میں پانچ لاکھ کی رقم کے علاوہ دفتر کی دس ہزار کی رقم بھی موجود تھی۔

میں بچتی بچتی نظروں سے اس رقم کو دیکھنے لگا، میرا دل اچھل کر غل میں دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے جیسے دلدل میں دھکا دے گیا تھا۔ اب میرے پاس اس دلدل سے نکلنے کے لئے نکلے کا سہارا بھی نہیں تھا۔

پھر مجھے قانونی گرفت سے اس طرح نجات ملی کہ ان لوگوں کے کہنے پر میں نے ایک ایسی تحریر لکھ کر دے دی جو میرے لئے کسی وقت بھی پھانسی کا پھندا ثابت ہو سکتی تھی، اس تحریر سے میں کسی بھی لئے قانون کی گرفت میں آ سکتا تھا لیکن یہ مجبوری تھی۔

کے جنم میں جدوجہد اور مشقت کرنا تھی۔ پشمن کی رقم سے گزارہ کیوں کر ہوتا اور بس انداز میں ہوئی رقم کب تک چلتی؟ میں نے دو تین بڑے اخبارات میں خلی آسمانیوں کے اشتہارات دیکھے اور تین دن میں کوئی پندرہ میں درخواستیں لکھ کر ارسال کر دیں اور کچھ دفاتر کے پتھر بھی کاٹے۔ ایک دن شام کے وقت مجھے اس قدر دھشت محسوس ہوئی کہ میں اپنی پسندیدہ اداکارہ کیوری کی فلم کا آخری شو دیکھنے نوبارکٹ چلا گیا۔ بلا کا بینما میں کئی بھٹوں سے یہ فلم چل رہی تھی۔ جب میں فلم دیکھ کر لوٹا تو رات کا ایک بیج رہا تھا۔ گلیاں سنسان اور ویران پڑی تھیں، چاروں طرف ایک گمراستا طاری تھا، میں رنگین سڑک کے ٹکڑے پر پہنچا تھا کہ عقب سے کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی، میں نے پلٹ کر دیکھا سڑک لائٹ کی زرد روشنی میں ایک نوبلی ہولادھشت زدہ انداز میں میری سمت دوڑتا چلا آ رہا تھا، میں ٹھک کر رک گیا۔ میری رگوں میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی، وہ

بھاگتے بھاگتے پیچھے کی طرف بابر دیکھتی جا رہی تھی، اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھک کر دی، وہ ایک نوجوان اور پشمن لڑکی تھی۔ اس کے چہرے سے دھشت اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا اس نے میرا سراپا جائزہ لیا اور میرے قریب پہنچ کر میرا شانہ تمام لیا۔

”خدا کے لئے..... آپ مجھے بچالیں۔“ اس نے پھولی ہوئی سانس کے درمیان کہا۔ ”بد معاش میرے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔“

”کون لوگ ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”میں انہیں نہیں جانتی۔“ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”جلدی سے بھاگ پلے۔ مجھے کہیں چھپا دیجئے۔“

”ڈرو نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”وہ تعاد میں کتنے ہیں؟“

”چار ہیں۔“ اس نے خوف زدہ نظروں سے پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے کانپتی

آواز میں جواب دیا۔ ”ان چاروں کے پاس چاقو بھی ہیں۔“

ٹھک ہار کر میں زیب النساء کے بارے میں سوچنے لگتا، اس کا تازہ شدہ پیکر میرے تصورات میں لہراتا تو دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہوتا، میں نے کئی بار سوچا کہ زیب النساء سے ایک ہار مل لینا چاہئے۔ اس سے مل کر صفائی پیش کرنا چاہئے۔ ممکن ہے اس کے دل میں میرے لئے بھر دی کے جذبات موجزن ہوں۔ شاید اسے میری بے گناہی یقین ہو میں دکھ سے یہ سوچ کر رہ جاتا کہ حالات نے میرے ساتھ کس قدر سختیں مذاق کیا ہے۔ زیب النساء اس واقعے سے ایک دن پہلے ہی میری جانب مائل ہوئی تھی اس کی قربت نے مجھے عجب سے احساسات میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں زندگی کے اس رخ کی طرف دیکھنے لگا تھا جو اب تک میری نظروں سے اوجھل رہا تھا لیکن دوسرا ہی دن میری زندگی میں تاریکی لئے طلوع ہوا اور میرا سب کچھ اس میں کھو کر رہ گیا۔

☆-----☆-----☆

ایک ہفتے کے بعد میں نہ چاہتے ہوئے بھی زیب النساء کے گھر جا پہنچا۔ میں اسے اپنی بے کنایہ کالیقین دلانا چاہتا تھا اس طرح میرے اعصاب ہلکے پھلکے ہو جاتے وہ ایک ذہین، سمجھدار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھی اس کی نمکداری میرے دل سے پھانس نکال سکتی تھی، مجھے جینے کا حوصلہ دے سکتی تھی، لیکن مجھے دیکھتے ہی اس کی شبابی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، اس کا حسین چہرہ نفرت سے سکڑ گیا۔ اس کی جمیل میزمرہ گہری آنکھوں میں چنگاریاں سی بھڑکتے لگیں اس کا ایک ایک لفظ میرے دل میں زہریلا تیر بن کر اتر گیا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر رکھائی سے پیش آئے گی۔ اس نے مجھے کچھ بولنے اور صفائی پیش کرنے کا موقع تک نہیں دیا تھا، میرا دل اندر سے ٹوٹ کر کسی کالج کی طرح ریڑھ ریڑھ ہو گیا۔ جب میں شکستہ دل اور نامراد لوٹنے لگا تو اس نے خستہ لہجے میں تنبیہ کی۔ ”آپ آئندہ اپنی شکل دکھانے کی زحمت نہ کریں۔“

ایک ہفتہ اور گزر گیا، آہستہ آہستہ میں ذہنی طور پر نارمل ہو گیا۔ تنگ دہشتی اور فکر معاش نے زیب النساء کا خیال دل سے کافی حد تک دور کر دیا تھا۔ اب مجھے دوبارہ زندگی

”آخر وہ گئی کہاں؟“ ایک گرفت آواز گہرے سائلے میں گونجی۔

”کسی گھر میں تو نہیں گھس گئی؟“ دوسری آواز نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”اتنی جلدی وہ کس کے گھر میں پناہ لے سکتی ہے۔“ ایک تیسری آواز نے سرگوشی

کی۔ ”شاید وہ کسی اور گلی میں چلی گئی ہے۔“

”کیوں نہ ہو اس جگہ میں تو نہیں چھپ گئی؟“ چوتھی آواز نے اپنا ٹنک ظاہر کیا۔

”کیوں نہ ہم اس کی تلاشی لیں۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔“ گرفت لمبے نے تاکید کے انداز میں کہا۔

لڑکی کے بدن پر جیسے بجلی سی گر گئی وہ دہشت زدہ ہو کر میری بیٹھ سے چپک گئی

تھی۔ اس کا پورا بدن دیرے دیرے کانپ رہا تھا، میں خطرہ محسوس کرتے ہی نیم تاریکی

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جس سے اپنا دفاع کر سکوں اور لڑکی

کو بھی ان بد معاشوں سے محفوظ رکھ سکوں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے ایک ڈنڈا پڑا

دکھائی دیا۔ میرے بدن میں فرحت کی سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے سرعت سے وہ ڈنڈا اٹھایا

اور ساتھ ہی ایک بڑا پتھر اٹھا کر لڑکی کے ہاتھ میں تھمادیا۔

”کوئی بد معاش اس طرف آئے تو تم بلا جھجک اس کے سر پر پتھر دے دلاؤ۔“ میں

نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

لڑکی کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھ میں پتھر کانپنے لگا۔ خوف

کی شدت سے وہ بڑی طرح لرز رہی تھی۔ میں نے اس کا شانہ پتھپتھایا۔ ”گھبرو نہیں۔“

میں ان بد معاشوں سے اب تنہا بھی نٹ سکتا ہوں، بس تم صرف ایک کی خبر لے لینا

جانوں کو میں منجبال لوں گا۔“

صرف ایک بد معاش بچکے کے احاطے میں داخل ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے

اندازہ ہوا کہ وہ عجبی صے کی طرف کسی قدر آہستگی سے آ رہا ہے۔ میں نے سینے میں

سائیں روک کر ڈنڈے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی اور متوقع حملے کے انتظار میں چوکنا ہو

میرے بدن میں خون کی گردش تیز ہو گئی یہ لمحہ ایسا تھا کہ میں اس لڑکی سے مرہ

پوچھ گچھ نہیں کر سکتا تھا وہ اس قدر دہشت زدہ اور ہراساں نظر آ رہی تھی کہ مجھے اس پر

ترس آ گیا۔ میں نے اسے ہر قیمت پر بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لمحے میں نے بہت دور

سے کئی آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں سنیں جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔

میں نے لڑکی کا منہ ہاتھ پکڑا اور منی سٹریٹ کی طرف اسے لے کر پکاد

آوازیں اب برابر کی گئی سے آ رہی تھیں۔

دفعۃً گہری خاموشی چھا گئی اور پھر اس سائلے میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ”لڑکی

..... ادھر..... منی سٹریٹ کی طرف گئی ہو گی۔“

لڑکی کے منہ سے بے ساختہ سی چیخ نکل گئی۔ خطرہ ہمارے سروں پر موت بن کر

منڈلانے لگا تھا۔ اگر ایک بد معاش ہوتے تو میں آسانی سے ان سے نٹ سکتا تھا لیکن

لڑکی نے بتایا کہ وہ تعداد میں چار ہیں اور مسلح بھی ہیں۔ میں نہتا شخص ان چاروں

بد معاشوں سے بیک وقت کس طرح نمرد آزما ہو سکتا تھا۔ میں لڑکی کو تقریباً گھسیٹا ہوا

ایک بچکے کی طرف بڑھلا۔ بچکے ڈاکٹر جو بھاری کا تھا جو اپنی بیوی اور دو بیٹیوں کے ساتھ

رہتے تھے۔ بچکے کا گیت بوسیدہ حالت میں کھلا پڑا تھا۔ میں لڑکی کو لئے ہوئے تیزی کے

ساتھ بچکے کے احاطے میں گھس گیا۔

پورا بچکے تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن یہ تاریکی ہمارے لئے معاون ثابت ہو رہی

تھی، ہم دونوں چروں کی طرح دبے پاؤں عجبی صے میں آ گئے۔ لڑکی مجھ سے لگ کر

کھڑی ہو گئی اور اپنی پھولی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ پندوس کے کسی

بچکے کی منزل سے بکلی بکلی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی، میں نے اپنی ساری توجہ اور

اپنے کان سڑک کی طرف لگا دیئے۔ چند لمحات بھی نہیں گزرے تھے کہ بہت سے

قدموں کی آوازیں ابھریں اور وہ لوگ بچکے کے بیرونی دروازے کے پاس آ کر رک گئے

تھے۔

گیلہ

اچانک ہی کسی کمرے میں کھٹ پٹ کی آواز گونجی اور احاطے کے ایک گوشے میں روشنی پھیل گئی۔ شاید کوئی کمری کھولی تھی۔ اس بد معاش کے قدموں کی آواز پر ایک لخت بند ہو گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ بیرونی گیٹ کی طرف لپکا اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

”کون ہے؟“ ڈاکٹر چدری کی مانوس آواز سنانے میں گونجی۔ ”کون ہے بھئی؟“ اس آواز کے جواب میں وہ لوگ تیز تیز قدموں سے جانے کس سمت چل پڑے تھے۔ چند ثانیوں کے بعد کڑی جگے سے شور کے ساتھ بند ہو گئی۔ دوبارہ وہی اندھیرا اور سکون طاری ہو گیا۔ تاہم میں نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں خطرہ ٹل جانے کا اچھی طرح سے یقین کر لیتا چاہتا تھا۔ کیونکہ ان بد معاشوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ باہر کہیں چھپ کر انتظار بھی کر سکتے تھے۔

خاصی دیر گزر جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ میں نے گردن کھما کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی تھی۔ میں نے اس کے قریب ہو کر اسے دھمکتی دی کہ وہ دبے پاؤں میرے ساتھ آئے لڑکی نے اپنے سینے اور شانے پر ساڑھی کا پلور دست کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔

ہم چند ثانیوں میں سوک پر پہنچ گئے تھے۔ میں اسے اپنے ہمراہ لے کر دائرہ سریت کی طرف بڑھا جہاں میری قیامگاہ تھی۔ یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اس کے گھر کا پتہ دریافت کر تا اور اسے لے جا کر اس کے گھر چھوڑ دیتا۔

اچانک ہی بہت دور سے کئی آدمیوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ خطرہ ہمارے سروں پر دوبارہ منڈلانے لگا تھا۔ ہم دونوں تیز تیز قدموں سے چلے گئے۔ چند لمحے بعد ہم دائرہ سریت پر آ گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے ٹالا کھولا اور لڑکی کو ساتھ لے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ لڑکی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میں نے اندر سے

دروازہ بند کیا اور زیر دیاور کا ٹانٹ بلب روشن کر دیا۔ ٹیوب لائٹ روشن کر کے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ بد معاش میرے کمرے میں اتنی رات گئے روشنی دیکھ کر مٹھوک ہو سکتے تھے۔

زیر دیاور کے بلب کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ میں لڑکی کا سر بایا وضع طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ مناسب بدن اور جاذب نظر نقوش کی مالک تھی لیکن اس کے چہرے پر جو علامات نمایاں تھیں اس سے میرے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ مٹھوک کردار کی لڑکی ہے۔ مجھے اس لمحے ہلکا سا تسف ہوا۔ ایسے ویسے کردار کی لڑکی کا بد معاشوں سے بھی تعلق ہو سکتا تھا۔ ایک انجانے خوف کا احساس میری ریڑھ کی ہڈی کو چھو گیا۔ اس کی یہاں موجودگی میرے لئے رسوائی کا سبب بن سکتی تھی۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس لڑکی سے جتنی جلدی چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اسی قدر میرے حق میں بہتر ہے گا۔ لڑکی کا لباس بڑی حد تک بے ترتیب سا نظر آیا لیکن اسے اپنا ہوش ہی کمال تھا۔ وہ میرے کمرے کے وسط میں کھڑی ہوئی کسی قدر بے نیازی سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھی۔ میرا کمرہ ایسا آراستہ بھی نہیں تھا کہ کسی کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ یہ ایک سادہ سا کمرہ تھا اس میں کسی قسم کی کوئی تزئین و آرائش نہیں تھی۔

میں نے قیاس کیا کہ وہ بے مقصد کمرے کے در دیوار کو تک رہی ہے جیسے اس کا مقصد محض وقت گزاری ہو۔ کتنے ہی محنت گزر گئے۔ میں نے اسے اس قدر مطمئن پا کر متعجب نظروں سے دیکھا۔ اس پر کسی قسم کا خوف و ہراس طاری نہیں تھا۔

”تم نے اپنے ہارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”جلدی سے مہاراجہ سناؤ تاکہ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔“

اس نے میری طرف پلٹ کر مجھے جیسی نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سرفی سی دوڑ گئی۔ ایک انجانا احساس اس کی آنکھوں میں ابھرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ٹکڑے کے انداز میں کھلے مگر کسی خیال کے تحت اس نے اپنی مسکراہٹ کو مخمد کر دیا۔

فوراً ہی اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

ان سب کی نظریں اس لڑکی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں مگر لڑکی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اسی طرح بے حجابانہ انداز میں کھڑی رہی۔

زین العابدین صاحب نے لڑکی کو ایک نظر دیکھنے کے بعد پلٹ کر میری طرف دھکیں نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جو سوال تھا اس نے مجھے بڑی طرح بولا کھلا دیا۔ انہوں نے کرفٹ لیے جس میں مجھ سے پوچھا۔ ”یہ لڑکی کون ہے؟“

میں نے کچھ کتنا چاہا لیکن الفاظ حلق میں انک کر رہ گئے۔ میں ان سے کتنا بھی کیا؟ لڑکی جس عالم میں کھڑی تھی اس نے میرے کردار کو ان لوگوں کی نظروں میں محسوس کر دیا تھا۔ میں سمجھنے کی حالت میں کھڑا رہا۔

محلے کے بزرگ مجھے کم مہم پا کر مخاطب ہوئے۔ ”آپ کو اس محلے میں یہ کمرہ اس لئے کرائے پر دیا گیا تھا کہ شریفوں کی طرح رہیں گے۔ اس محلے میں ہونیٹیاں اور جوان لڑکے رہتے ہیں۔ آپ جیسے ذمہ دار آدمی کو یہ نصاب نہیں دینا کہ بدکار عورتوں کو اپنے ہاں لے کر آئیں۔“

یہ ایک ایسا الزام تھا کہ میں تھلا کر رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سینے پر گرم گرم سلاخ داغ دی ہو۔ نیکی کا صلہ مجھے ذلت اور رسوائی کی صورت میں مل رہا تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے مختصر الفاظ میں انہیں ساری کہانی سنائی۔

ان لوگوں کے چروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں میرے ایک لفظ پر بھی اقبال نہیں آیا ہے۔ زین العابدین پھر سے پولیس اسٹیشن گئے۔ انہوں نے مجھ پر بے رحمانہ لہجے اور سخت الفاظ میں جرح شروع کر دی۔ میں نے ان کے تمام سوالات کے صحیح جوابات دیے مگر انہیں پھر بھی یقین نہیں آیا۔ انہوں نے لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا یہ سارے واقعات درست ہیں؟“

”جی نہیں۔“ لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ساری کہانی من گھڑت ہے۔ یہ

وہ بولی تو اس کے لیے جس میں خوف کا زور سا بھی شامل ہو محسوس نہیں ہوا۔

”میں ابھی آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں، پہلے اپنا لباس ٹھیک کر لوں۔“

اس نے میرے کچھ کہنے سے پشیمان سا مڑی کاپلہ شانے سے الگ کیا اور اب صرف پٹنی کوٹ اور بلاؤز میں میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں دوسری طرف منہ پھیر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی اس بے باک اور علمیانہ حرکت پر میرے دل میں نفرت سی پیدا ہوئی۔ اس میں کسی قسم کا حجاب بھی نہیں تھا۔ گویا میرا اندازہ اس کے بارے میں درست ہی تھا۔

اسی پہل میں نے اپنے کمرے کے آس پاس بہت سے قدموں کا شور سنا۔ دوسرے ہی لمحے دروازے پر مسلسل دستک ہونے لگی۔ میں گھبرا گیا اور میں نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم ابھر کے پھیل گیا۔ اس کی آنکھیں کسی احساس کی شوقی سے چمکنے لگیں۔ میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں نے بدحواس ہو کر فرقتش آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”دروازہ کھولو۔“ ایک مائوس آواز ابھری یہ آواز زین العابدین کی تھی جو اسی محلے میں رہتے تھے اور غارڈز پولیس انسپکٹر تھے۔

میں ان کی آواز سن کر حیران بھی ہوا اور اس کی قدر سراپہ بھی۔ اتنی رات گئے ان کا آنا غالی از علت نہیں تھا۔ ان کے ساتھ اور بھی لوگ تھے جن کی آوازوں کی جھنجھٹاہٹ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے پشیمان لڑکی کی طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ دستک تھی کہ مسلسل ہوئے جارہی تھی۔ مجھے دروازہ کھولنے کے سوا کوئی اور صورت نظر نہیں آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سب سے پہلے میری نظریں زین العابدین پر پڑی، مجھے دیکھ کر ان کا منہ نفرت سے گیا۔ ان کے ساتھ محلے کے ایک بزرگ اور دو آدمی اور بھی تھے جن کے چہرے میرے لئے اجنبی تھے۔ وہ سب دندناتے ہوئے میرے کمرے میں گھس آئے۔ ایک شخص

لیکن میں نے اس وقت یہ فیصلہ کیا کہ میرا نہ جانا بہتر ہے، سفر میں نہ جانے کیا واقعہ پیش آئے۔ میں ایک مرتبہ پھر ذہنی طور پر بڑی طرح الجھ گیا تھا۔ گو یہ دوسرا واقعہ کسی قدر مختلف نوعیت کا تھا لیکن میرا دل اس شر سے اچاٹ ہو کر رہ گیا۔ قسمت نے میرے ساتھ عجیب کھیل کھیلا تھا آخر یہ سارے واقعات کس لئے پیش آرہے ہیں؟ کون کھ پتلی کا کھیل کھیل رہا ہے؟ کس کے ہاتھ میں اس کی ڈوریاں ہیں؟ میں کرب، دکھ اور غصے سے سوچتا اور اپنا دل موسس کر رہا جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ اپنے نابیدہ دشمن کو کہاں اور کیسے تلاش کروں؟

مجھے چھ سات دنوں کے بعد دو تین جگہ سے انٹرویو کے لئے طلب کیا گیا۔ ایک فرم نے اپنے طور پر کثیر کی ملازمت کی پیشکش کی لیکن میں نے توبہ کر لی تھی کہ آئندہ کبھی ایسی ملازمت نہیں کروں گا۔ میں ایک دن کرینٹ نیکنائل ملز میں سیکوریٹی آفیسر کے عہدے کے لئے انٹرویو دینے پہنچا، انٹرویو بعد کا میاب رہا اور تیسرے دن مجھے اس کمپنی کی جانب سے تقریر نامہ موصول ہو گیا۔

کرینٹ نیکنائل ملز میں یہ میرا پہلا دن تھا۔ میں اپنا تقریر نامہ لے کر رسمی اور ذاتی کے طور پر ڈائریکٹر کے کمرے میں حاضری دینے پہنچا۔ ڈائریکٹر اس وقت ٹیلیفون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز کی لرزش بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ ٹیکاک اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس آیا اور ریسیور ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے پتھر۔ اس کا چہرہ زرد ہوا چلا گیا۔ اسے سراپائی کے عالم میں دیکھ کر مجھے کسی قدر حیرانی ہوئی اور اس پر ترس مٹ گیا۔ اس ڈائریکٹر نے میرا انٹرویو لیا تھا اور تقریر نامہ اس کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔

جب اس نے اپنی گفتگو ختم کر کے ریسیور کرپٹل پر رکھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ اپنی ہڈی جگہ سے اٹھ بیٹھا اور پھر اس کا چہرہ خستہ ہونے لگا۔

صاحب مجھے دو سو ٹاکا کے عوض یہاں لے کر آئے ہیں اور میں یہاں پہلی بار نہیں آئی ہوں، یہ بات آپ کی ہوں۔“

میں لڑکی کی زبان سے اس قدر سفید جھوٹ اور ہستان سن کر سائلے میں آ گیا۔ دوسرے لمبے میری رگوں میں خون اگلنے لگا۔ میں غضب ناک انداز میں لڑکی کی طرف جھانکا مگر اس نے دوڑ کر ان لوگوں کے درمیان پناہ لے لی۔

پھر میرے ساتھ وہی کچھ پیش آیا جو میں نہیں چاہتا تھا اور میرے لئے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ سب سے پہلے اس لڑکی کو نکال دیا گیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے بڑی دیر تک میرے کردار پر نشتر آمیز رائے زنی کی، مجھ پر لعنت ملا مت کی گئی۔ میں اس واقعے میں کچھ اس طرح ملوث ہو گیا تھا کہ کسی صورت میں انہیں اپنی بے گناہی یقین نہیں دلا سکتا تھا۔

میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان کے ہر حکم کی تعمیل کروں۔ اس نتیجے میں مجھے ایک تحریر دینا پڑی جس میں میں نے اپنی بدکاری کا اعتراف کرتے ہوئے آئندہ ایک شریف آدمی کی طرح اس محلے میں رہنے کا عہد کیا تھا۔

زمین العابدین صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اس واقعے کا کسی سے تذکرہ نہیں جائے گا لیکن مجھے بھی اپنی اس تحریر کا پاس کرنا ہو گا۔ میں اگر دوبارہ بدکاری میں ملوث گیا تو وہ مجھے فی الفور قانون کے حوالے کر دیں گے۔

ان لوگوں کے باہر نکلنے ہی میں کسی ٹوٹی شاخ کی طرح ہستہ زخمی ہو گیا۔ میں اپنا سر ختم لیا۔ اس ذلت اور رسوائی سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

ذہن مایوس ہو گیا۔ طرح طرح کے خیالوں کی پورش مجھے باگل کئے دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیا اب مجھے کبھی کسی کے ساتھ بھلائی نہیں کرنا چاہئے؟ خاص کر کسی عورت کے ساتھ۔

مجھے کوئی ایک ہفتے کے بعد کو میلا شراپے ایک دوست سے ملنے کے لئے جانا

اس کے انکار نے مجھ پر جنون طاری کر دیا۔ پھر میں نے کسی نتیجے کی پرواہ کئے بغیر جھک کر سفاکی سے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ لیا اور اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ ”اگر تم نے اس شخص کے بارے میں نہیں بتایا تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔“ میں نے دھمکی آمیز میں کہا۔

اسے شاید توقع نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ اس قدر درندگی سے پیش آؤں گا۔ اس نے تھوک نکلنے ہوئے مجھے دہشت زدہ نظروں سے دیکھا پھر مرتش آواز بولا۔ ”ایک منٹ ممبر کرو۔۔۔۔۔ میں ابھی بتاتا ہوں۔“ میرا کالر چھوڑ دو۔“

میں نے اس کے کوٹ کے کالر پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور بے تپانہ نظروں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس نے اپنا کوٹ درست کرتے اور بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے غمر فھر کر کہا ”میں اس شخص کو ذاتی طور پر بالکل نہیں جانتا نہ ہی میں اس کے نام اور پتے سے واقف ہوں۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے اس کا ٹیلیفون آیا تھا۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ آج ہی بلکہ اسی وقت تمہیں ملازمت سے نکال دوں اور اس کے عوض ایک پیسہ بھی نہ کھوں لیکن میں پھر بھی تمہیں پانچ سو ناکادے رہا ہوں“ تم اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گے۔“ اس کی آواز اٹکنے لگی۔

”مگر جب تم اس شخص سے واقف نہیں ہو تو پھر اس کے حکم کی تعمیل کس لئے رہے ہو؟“ میں نے اس کی طرف مشتبہ انداز سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم مجھ جیوت نہیں بول رہے ہو؟“

اس نے ہنرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”حکم عدلی کی صورت میں مجھے اپنی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ میری جوان اور اکلوتی بیٹی اس وقت اس کے پاس ہے۔ اس نے ٹیلیفون پر مجھے میری بیٹی کی آواز سنائی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔“

میں سانس میں آ گیا اور مجھ پر سکے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ آخر وہ کون

تھا؟ میں نے پکارتے ہوئے سوچا۔ اسے مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ یہ میری ملازمت کے ارپے کیوں ہو رہا ہے؟ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ گو میرے ذہن میں کئی بار یہ خیال آیا کہ پس پردہ وہ میرا کوئی دشمن ہے لیکن میں نے اسے دوسری طرف دبا دیا۔ بھی تصور کیا تھا؟ کیونکہ بلا ہراس کی کوئی بنیادی وجہ نہیں تھی۔ میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے ہیں وہ محض اتفاقات بھی ہو سکتے ہیں۔ دشمنی اس وقت کی جاتی ہے جب کسی کے پاس دولت ہو یا کوئی درافت کا معاملہ ہو یا پھر کوئی ایسا عہدہ جو کسی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بن رہا ہو۔ میرے ساتھ ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ ایسا کوئی معاملہ سرے سے ہی موجود نہیں تھا۔ پھر آخر یہ دشمن کہاں سے نکل آیا؟

میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”آخر اس شخص کو میرے ساتھ کیا دشمنی ہے؟“

”تم خود ہی سمجھ سکتے ہو؟“ اس نے مردہ لہجے میں جواب دیا۔

میں نے فوج کی ملازمت سے بلکہ دوش ہونے کے بعد ڈھاکہ شرمیں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس شرمیں ملازمت کر کے اپنی تہذیبی آزائی سے گزار لوں گا۔ میں اب اپنے گاؤں جانا نہیں چاہتا تھا۔ گاؤں میں میرے لئے رکھا ہی کیا تھا۔ میرے ہاں باپ فوت ہو چکے تھے۔ دنیا میں میرا کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا۔ میں نے بالآخر ایک دوست کی بیٹی کی شادی پر خرچ کر دیا تھا۔ اس دوست نے ہندوستانی سرحد پر گھڑوں میں میری جان بچائی تھی جس کے نتیجے میں وہ خود ایک بازو سے محروم ہو گیا تھا۔ ڈھاکہ جیسے شرمیں ایک ریٹائرڈ فوجی کے لئے زندگی گزارنا اس قدر آسان نہیں تھا۔ ڈھاکہ میں نے اپنے تئیں فرض کر لیا تھا۔ یہاں مکانوں کے کرائے انتہائی زیادہ تھے۔ اگلی کامریت آدھی کو نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ایک غریب کے لئے ایک وقت کی روٹی اچھا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے گزر اوقات کے لئے اپنی ملازمت کا آغاز کیا لیکن اس

دشمن کے ہاتھوں قدم قدم پر ذلیل و خوار ہوتا آ رہا تھا۔

میں نے اپنے دشمن کے بارے میں بہت سوچا اور کئی دنوں تک نفرت غصے اور

اپنے حواس کو قابو میں رکھنا۔ میں ایک سپاہی تھا اور میدان جنگ میں بے شمار خون خرابے سے گزر چکا تھا۔ تاہم اس کے باوجود میں نے اپنی رگوں میں دہشت کی لرزہ سنانی ہوئی محسوس کی۔ میرے طلق میں گرہیں پڑنے لگیں۔ میں کتنے ہی لمحات تک بے حس و حرکت کھڑا لاش کو سٹکرا رہا۔

لاش منہ کے بل پڑی تھی اس لئے مختل چہرہ ٹھیک سے نظر نہیں آ سکا۔ جس حد تک چہرہ نظر آ رہا تھا اس سے مجھے کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کون ہے! اچانک ہی ایک فیمل میرے ذہن میں جھٹکنا بن کر لگا۔ یقیناً یہ ساری حرکت میرے انجانے دشمن کی تھی۔ اس نے مجھ پر ایک ایسی ضرب لگائی تھی کہ اب میری جان پچا بہت مشکل تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

میں راہ فرار اختیار کر کے مزید مشکلات میں پھنسا نہیں چاہتا تھا۔ میں آخر کرب تک خود کو پولیس کے ہاتھوں سے بچا سکتا تھا لیکن میں بے گناہ تھا۔ یہ سوچ کر میری فاسی ہمت بندھی۔ میں اپنے حواس مجتمع کر کے آہستہ آہستہ ہنگ کی طرف بڑھنا میں مختل کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے سیدھا کرنے میں دشواری یہ تھی کہ چاقو اس کی ذہن میں اتر رہا تھا۔ چاقو نکالنے بغیر لاش کو کسی بھی صورت میں سیدھا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں ہنگ کے بالکل قریب پہنچ گیا میں نے چاقو کے دستے پر ہاتھ رکھا یہ تھا کہ دفعتاً میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ ایک پل کے لئے پورا کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا تھا۔ میں نے ٹھہرا کر چاقو سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور کئی ثانیوں تک حواس باختہ کلیں جھپکاتا رہا۔ اسی وقت باہر گلی میں کسی کے دوڑنے کی آواز سنانی دی اور پھر سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ میرے دشمن نے ایسے عالم میں میری تصویر ادا کر لی تھی کہ اسے دیکھ کر ہر کوئی مجھے قاتل تسلیم کر لیتا۔ اس ثبوت کو کسی طرح جھٹلانا نہیں جاسکتا تھا مجھے اپنی حماقت کا فوراً ہی شدید احساس ہوا۔ وہ تصویر میرے لئے پھانسی کا پھندا بن سکتی تھی۔

جذباتی انداز سے سوچتا رہا کہ میری یادداشت میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے میں دشمن تصور کر رہا تھا۔ فوج میں بھی میرا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اپنی جہنم میں ہر دلعزیزی کا اعتراف کماؤر بھی کیا کرتے تھے میرے تمام کے تمام ساتھی مگر بے قصاص دوست تھے۔ وہ لوگ ہائز منٹ کے بعد اپنے اپنے گاؤں جا کر آباد ہو گئے تھے مجھے بھی اپنا گاؤں بے حد یاد آتا لیکن وہاں زندگی گزارنے کی کوئی سبیل بھی نہیں تھی۔ میرا ذہن اس بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا کہ اس نے میرا چین و سکون اور رات نیندیں حرام کر دی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرا انجانہ دشمن کون ہے مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ اگر وہ میری موت کا خواہاں ہے تو مجھے آسانی سے ختم کر سکتا ڈھاکہ پیسے شہر میں کسی کی زندگی کا خاتمہ کرنا ایسا مشکل نہیں تھا۔ یہاں ایسے پیشہ قاتل بھی تھے جو سو ٹاکا میں کسی کو بھی موت کی نیند سلا سکتے تھے۔

میری الجھن کسی طرح دور نہیں ہو رہی تھی۔ ان دنوں میں بے حد پریشان پریشانی کے عالم میں میں بازاروں اور گلیوں میں نکل جاتا اور بے مقصد اور ہر آدھر گھوم رہتا۔ گھر مجھے کانٹے کو دوڑتا تھا اور دو دیوار سے وحشت ٹپکتی تھی۔ ایک نامعلوم خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔ میں اس عرصے میں بیسیوں جگہ ملازمت کے لئے درخواستیں ارسال کر چکا تھا لیکن کہیں سے مجھے جواب نہیں آیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا میرے خلاف سرگرم عمل ہے۔

☆-----☆

ایک دن میں یونہی آوارہ گردی کر کے رات گئے گھر لوٹا اور پھر کمرے میں کرسی ہی اپنی جگہ سے اٹھ چلا جیسے کسی نے میری پشت میں خنجر گھونپ دیا ہو طلق سے چب لٹکتے لٹکتے رہ گئی۔

میرے لمبر خون میں لت پت ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی پیٹھ میں دسے تک پیوست تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یقیناً قتل کھا کر جاتا مگر میں

اتنی دور کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی وہ چاہتا تو میرے گھر کے قریب بھی اپنے ساتھی کا انتظار کر سکتا تھا۔ اس طرح اسے کسی ممکنہ خطرے سے واسطہ بھی نہیں پڑ سکتا تھا۔

میں جھکے جھکے قدموں سے گھر کی جانب واپس ہوا۔ مجھے جیسے کسی نے بڑی طرح ہموذ کر رکھ دیا ہو۔ فی الحال اس سے بھی تعین مسئلہ میرے سامنے تھا۔ میرے کمرے میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی میں دنیا والوں اور قانون کی نظروں میں قابل بن چکا تھا بار بار میری آنکھوں کے سامنے چٹائی کا پسندالرائے لگتے۔ ہر چند کہ میں بے گناہ تھا لیکن میری سزا کون؟ کون محض میری بے گناہی کا تعین کرتا۔ میرے خلاف قدم قدم پر ٹھوس ثبوت موجود تھے۔

میرے سینے میں نفرت اور انتقام کی آگ دیکھنے لگی۔ میں دکھ اور افسوس سے ہاتھ لے لگا کہ ایک موقع دشمن کو پکڑنے کا بلا بھی لیکن میں اس میں بڑی طرح ناکام رہا۔ میرے دل کے گوشے میں ایک اذیتناک احساس کسی نیزے کے انی کی طرح چبھنے لگا۔ میں نے کبھی میدان جنگ میں شکست کی ذلت نہیں اٹھائی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک پانی شکست سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

لیکن اس وقت مجھ پر جو کیفیت طاری تھی وہ شاید کسی شکست خوردہ سپاہی پر طاری نہیں ہوتی ہوگی۔

دشمن نے مجھ پر ایک ایسی کڑی ضرب لگائی تھی کہ اس نے میرے وجود کو پارہ پارہ کر دیا تھا میں جس قدر سوچتا دماغ اتنا ہی الجھتا۔ میں نے اپنے کمرے کی چوکت پر دونوں ہاتھ رکھ کر سر ٹکایا اور غم سے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دانستہ لاش کی جانب دیکھنے سے احتراز کیا تھا۔ نہ جانے میں کب تک اسی عالم میں ذہنی تکلیف سے دوچار ہوتا رہا۔

میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کون سا قدم اٹھانا چاہئے۔ بڑی دیر کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال آ سکا کہ پہلے ہلائی منزل پر مقیم کرانے والوں کو اس حادثے

میں نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر ہار بھاٹکا۔ گلی کے آخری سرے پر ایک محض بھاڑ ہوا نظر آیا۔ آج مجھے میرا دشمن نظر آیا تھا اور میرے لئے یہ موقع تھا کہ میں اسے قیمت پر پکڑ لوں۔ اسے جانے نہ دوں۔ اس خیال سے میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا اور گلی میں اسی سمت بھاگنے لگا۔ چار اطراف تاریکی چھائی ہوئی تھی بھاگتے بھاگتے میں ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر اٹھا فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور چوٹ کی پرواہ کئے بغیر دوبارہ دوڑنے لگا۔ مجھے ہر قیمت پر اس محض کو پکڑنا تھا تاکہ اس سے کیسہ اور قصور حاصل کر سکوں۔ وہ محض بھی اتحاد و جدت دوڑ رہا تھا ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل گیا لیکن اس کے جوتوں کی آواز سنائی دی۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر وہ جگہ تھی جہاں اس کے جوتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی میں نے اپنی رفتار کم نہیں کی بلکہ میں نے رفتار اور تیز کرتے ہوئے جلدی وہ موڑ ملے کر لیا۔

میرے اور اس کے درمیان کوئی نصف فرلانگ کا فاصلہ رہا ہو گا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار میرے مقابلے میں بہت تیز تھی کیونکہ وہ دپلے جسم کے تھا اور لمبے قد کا بھی تھا۔ وہ اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے چار سو گز کی دوڑ جیتنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اچانک سو گز کے فاصلے کے ساتھ سناٹا دی اور اس کے ساتھ تقریباً سو گز کے فاصلے روشنی پھیل گئی۔ میرا دشمن بھاگتا ہوا ایک سو گز پر سوار ہوا جس پر پہلے ہی سے ایک محض موجود تھا۔ دوسرے لمحے سو گز فرائے بھرتا ہوا میری مخالف سمت تیز رفتاری روانہ ہو گیا۔

میں دوڑتے دوڑتے رک گیا اور کسی قدر بے بسی سے سو گز کو جالتے ہوئے رہا۔ حتیٰ کہ وہ بائیں ہاتھ کی ایک گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میں کافہ افسوس لے لگا۔

یہ بات تو صاف ظاہر تھی کہ سو گز پر پہلے سے موجود محض میرے دشمن کا ساتھی تھا اور سو گز لئے ہوئے اسی کا انتظار کر رہا تھا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکی کہ آخر اسے

کی اطلاع دل۔ اس کے بعد زین العابدین سے رجوع کرنا۔ تیسرا مرحلہ پولیس کو مطلع کرنے کا تھا اس مرحلے میں میرے ساتھ کیا کچھ پیش آئے گا۔ میں اس سے بے خبر نہیں تھا مجھ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑنے کا جواز موجود تھا۔ میں حالات کا سامنا کرنے کے لئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔



میں نے ایسا نہ ہو کر کمرے میں بھاگنا اور بستر پر نظر پڑنے ہی میرا منہ حیرت سے اٹھار گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کوئی انتہائی بھیاں کیا اب دیکھا ہو بستر خالی پڑا تھا میں سرعت سے چنگ کے پاس پہنچا۔ بستر پر گہرے نیلے لٹک کی چادر چھپی ہوئی تھی۔ چادر پر بے شمار شکنیں نظر آ رہی تھیں مگر خون کا ایک مہر تک نہ تھا۔

حیرت کے اس جھٹکے نے مجھے کسی قدر بے حواس کر دیا تھا۔ میں دھم سے بستر پر گرا اور کائی دیر تک بے جان لاش کی مانند لیٹا رہا مگر میرا ذہن برابر سوچنے میں لگا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن کے گوشوں سے دھند چھٹنے لگی مجھے اپنے دشمن سے شدید نفرت ہو چکی تھی لیکن میں دل ہی دل میں اس کی ذہانت پر عرش پر عرش کے بغیر نہ رہ سکتا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ سکوتر کس لئے اس قدر دودھ کھڑا کیا گیا تھا۔ واضح طور پر دشمن کا قصد یہی تھا کہ جب میں اس کے تعاقب میں نکلوں تو اس اثنا میں لاش کو غائب کر دیا جائے۔

اچانک ہی ایک اور خیال میرے ذہن میں سرسرایا ممکن ہے کہ سرے سے کوئی افی سی نہ ہو بلکہ اس سارے ڈرامے میں ایک جیتے جاگتے شخص نے لاش کا کردار ادا کیا ہو مجھے یاد آیا کہ اس وقت میرے بستر پر گہرے سرخ رنگ کی دوسری چھپی ہوئی تھی یقینی طور پر دشمن کا مقصد یہی رہا ہو گا کہ خون کے دھبے میری چادر پر لگنے نہ پائیں۔ آہستہ آہستہ میرا یہ خیال یقین میں بدل گیا اس ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے کسی

پرندے کا خون اور پیرنگ والا نقلی طاقتو استعمال کیا گیا تھا جس کا پھل دیاؤ پڑنے سے میں چلا جاتا تھا۔

میں کافی دیر تک بستر پر کوئیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر میرے دشمن کا منصوبہ کیا ہے؟ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے اور کس لئے میرے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟ اگر اسے مجھ سے واقعی کوئی دشمنی ہے تو مکمل کر مقابلے پر کیوں نہیں آتا ہے۔ ایک شب یہ بھی میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ ممکن ہے کوئی غیر ملکی ایجنٹ فوجی حاصل کرنے کے چکر میں مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے مگر میں نے جلد ہی اس خیال ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ میں فوج میں ایک معمولی سا افسر تھا اور میں اسے کس سے اہم راز فراہم کر سکتا تھا اگر اس نے مجھ سے ایسی کوئی توقع وابستہ کر بھی رکھی تھی یہ سراسر اس کی غلط دماغی کا ثبوت تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک سبکدوش فوجی افسر اس لئے کسی طرح بھی بکر آمد ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

انہی خیالوں میں الجھتے الجھتے نہ جانے کس وقت مجھے نیند آگئی جب میری آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ دروازے پر کوئی آہستہ آہستہ اور دھکے دھکے سے دستک دے رہا ہے۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی، کھڑکی کی راہ سے نظر آیا تو احساس ہوا کہ دن خاصا چڑھ آیا ہے۔ میں نے اپنی دستی کھڑکی میں دیکھ دیکھ دس بجتے والے تھے چونکہ رات کے آخری پہر سو یا تھا اس لئے جلد بیدار نہ ہو سکا تھا میں ہڑبڑاکے بستر سے نکلا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

لحظہ بھر کے لئے میری آنکھوں میں روشنیوں سی اتر آئیں میرے سامنے ایک دلکش لڑکی کا سربراہرا ہوا تھا۔ سفید ساڑھی سے اس کی سالونی رنگت کو نکھار کر مزید فروزاں کر دیا تھا وہ اس سفید لباس میں لپٹی ہوئی جنت سے چمکے ہوئے کسی پھول طرح لگ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ ستارہ آنکھیں میں سے بہت کم دیکھی تھیں۔ اس نے اپنی سحر طراز آنکھیں میری

آنکھوں میں ڈال دیں۔ جب وہ بولی تو ایسا لگا کہ جیسے چاروں طرف جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔ ”کیا آپ کمپٹن محمد مصباح احمد ہیں؟“

میں اس اجنبی لڑکی کی زبان سے ایسا نام سن کر ایک دم چونک اٹھا تھا۔ میں نے متحجب ہو کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایک لمحے کے میرے دل میں خیال آیا کہ شاید دشمن نے مجھے چھاننے کے لئے پھر کوئی نیا جال بچھایا ہے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجتے لگیں۔ رات کے حادثے نے مجھے اس طرح سے بے بس کر دیا تھا کہ دشمن مجھے کسی بھی دن قانون کے حوالے کر کے چھانسی کے تختے پر پھنچا سکتا تھا اور اب صبح ہوتے ہی ایک اور مصیبت میرے گھر کی دالیز پر کھڑی ہوئی تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا پھر مجھے اپنی وہ تحریر یاد آئی جو میں نے زین العابدین کو لکھ کر دی تھی۔

”کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“ لڑکی نے نفیس لب و لہجے میں پوچھا۔

لڑکی بظاہر کسی قدر شائستہ مزاج کی دکھائی دے رہی تھی لیکن اسے میں اندر آنے کی اجازت دے کر کسی قسم کا خطرہ مول لیتا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے زین العابدین سے لڑائی طور پر وعدہ کیا تھا کہ آئندہ کسی عورت کو اپنے ہاں نہیں بلاؤں گا۔ اگر موصوف اسے دیکھ لیتے تو یقیناً میری شامت آسکتی تھی۔ میں عجیب سی نگاہ میں جھٹا ہو گیا۔ لڑکی نے میرے جواب کا انتظار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ وہ میرے قریب سے گزرتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی اس کے کھلے ہوئے سیاہ بالوں کی نمک میرے منہم جان کو فہمیں کر گئی۔ میرے سارے وجود میں عطربیز ہوا میں پھلتے لگیں۔ مجھے بے اختیار گاؤں کے بھولے بسے دن یاد آ گئے۔ میرے سینے میں خوابیدہ تناسل چمکنے لگیں۔

میرا کمرہ کسی قدر بے ترتیب ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لڑکی کو بٹھاؤں یا رخصت کر دوں۔ میرے کمرے میں جو کرسی تھی اس لڑکی کے لائق بھی نہیں تھی۔ اس نے کمرے کا سرسری انداز سے ناقدانہ سا جائزہ لیا اور کسی قدر اطمینان سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”مجھے نیلو کہتے ہیں۔“ وہ میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرائی اور اس نے حترم لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کے لئے ایک پیغام لائی ہوں۔“

وہ اپنا سیاہ چمڑی پرس کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگی مجھ پر ابھی تک بے خودی سی چھائی ہوئی تھی اس کے سرپا سے پھونسنے والی خوشبو نے پورا کمرہ مگادیا تھا میں اپنی جگہ جمنا سا ہو کر اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔

اس نے چند لمحوں کی تلاش کے بعد پرس میں سے ایک پرزہ نکال کر میری طرف پرحالیا۔ میں نے اس کے خوبصورت، نازک اور سڈول ہاتھ سے وہ پرزہ لے کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس پر ایک نظر ڈالی۔ پرزے پر کسی شخص کا نام درج نہیں تھا البتہ ایک گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا یہ گھر کا پتا ہے؟“

”جی ہاں۔“ وہ اپنا خوشناس سر ہلا کر بولی۔ ”یہ پتا ادریس الحق صاحب کا ہے۔ انہوں نے آپ کو شام پانچ بجے جانے پر مدعو کیا ہے۔“

”یہ ادریس الحق صاحب کون بزرگ ہیں؟“ میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ”کیا آپ انہیں نہیں جانتے؟“ اس نے کسی قدر حیرانی سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

”جی نہیں۔“ میں نے لٹی کے انداز میں اپنا سر ہلایا۔ ”یہ نام پہلی مرتبہ آپ کی زبان سے سن رہا ہوں۔“

”وہ بنگلہ دیش کے بہت بڑے تاجروں میں سے ایک ہیں۔“

”ہوں گے۔“ میں نے بے نیازی سے اپنے شانے اچکائے۔ ”میں ایک رینائرڈ فوجی افسروں۔ مجھے تاجروں سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟ پائی دی وے ان صاحب نے مجھے کس لئے بلایا ہے؟“

”ملازمت کے سلسلے میں۔“

”ملازمت؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”میں نے ان کے ہاں کوئی درخواست تو نہیں دی ہے۔“

”آپ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچیں۔“ لڑکی حترم لہجے میں کہنے لگی۔ ”ایئرٹن انٹرنیشنل کمپنی کی جانب سے آپ کو متعدد خطوط لکھے گئے۔ اس میں تقریر نامہ بھی شامل تھا لیکن جب آپ نے ایک مرتبہ بھی رجوع نہیں کیا تو کمپنی اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید آپ کو وہ خط نہیں ملے ہیں اس لئے آپ مجھے آپ سے رابطہ قائم کرنے کو کہا گیا ہے۔“ مجھے واقعی کوئی خط نہیں ملا تھا بلکہ میری درخواستوں تک کا جواب نہیں آیا تھا اب میں سمجھ گیا کہ میرا دشمن میری ہر راہ میں رکاوٹیں ڈال رہا تھا۔ وہ میرے خط اڑاتا تھا کہ میں ملازمت سے محروم رہوں اور کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاؤں اس طرح وہ اپنے ہدایت کی تسکین کر رہا تھا۔ یہ لڑکی نہ آتی تو مجھے اس کی کبھی بھی خبر نہ ہوتی۔

کسی کمپنی کا مجھ میں دلچسپی لینا بھی کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ پس پردہ ضرور کوئی بات تھی جو میرے ذہن میں کلک رہی تھی۔ میں نے استہزائیہ انداز سے پوچھا۔ ”کیا ایک ہالی فرم میرے اختصار میں سوکھ رہی ہے؟“

لڑکی میرے لہجے کی گرمی محسوس کر کے کھکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے دانت آپ دار موتیوں کے مانند چمک اٹھے۔ اس نے گفتگوائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”میں فوجی افسروں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ وہ اپنی فرم میں فوجیوں کو زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا چاہتے ہیں اس لئے میرے ہاں نے آپ میں دلچسپی لی ہے اور مجھے آپ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بھیجا ہے۔“

”وجہ؟“

اس کے رخساروں پر سرخی بکھر گئی۔ وہ ہنس پڑی تھی۔ اس نے سامنے لہجے میں جواب دیا۔ ”اس لئے کہ فوجی ایک سویلین کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذمہ داری کا لوہہ دیتے ہیں۔ ہماری فرم میں زیادہ تر سبک دوش فوجی کام کر رہے ہیں۔ میرے ہاں

ہوئی تھی۔ میں اس کے حصول کا خوابوں میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک
 اتنی ہی رقبہ کی ادائیگی میں کوئی دشواری محسوس نہیں کر رہا تھا جیسے وہ دو سو ٹاکا ہوں۔
 لگ رہا تھا یہ رقم اس کے نزدیک کوڑیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس ملک
 ایسے بڑے لوگ موجود تھے جن کے لئے دولت کبھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی
 دوسرے لمحے میں اس شیریں تصور سے نکل آیا اور سنبھل گیا۔ میں نے اس کی طرف
 مشکوک نظروں سے دیکھا اور اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے تجسس آمیز لہجے
 دریافت کیا۔ ”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

اس کے چہرے پر جو سپاٹ پن تھا وہ ایک لخت مٹ گیا۔ اس کی جگہ درندگی لے لی۔ اس نے اپنے جڑے کسی قدر بخنی سے اندر کی طرف بھیجے لئے۔ اس آنکھیں سرخ ہی ہوئے لگیں۔ اس کے ہنرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت سے کھول رہا ہے۔ پھر وہ بے حد سرد و سفاک لہجے میں بولا۔ ”تمہیں ایک عورت کو کرنا ہو گا۔“

”کیا؟“ میں اس طرح سے اچھل پڑا جیسے مجھے بجلی کا شاک دیا گیا ہو۔
عورت کو قتل کرنا ہے؟“

"ہاں۔ اس نے اپنی زبان سے صرف اتنا ہی کہا۔
"قتل....." میں سراپیدہ سا ہو گیا اور میری نس نس میں سفتابٹ سی
گئی۔ "آخر آپ ایک عورت کو کس لئے قتل کرانا چاہتے ہیں؟" میری آواز
ارتعاش سا پیدا ہوا۔

”کیا تمہارے نزدیک کسی کو قتل کرنا مشکل کام ہے؟“ اس کا چہرہ خوفناک ہو
 ”آخر اس میں اس قدر کچھ کی کیا بات ہے؟ فوجی میدان جنگ میں اپنے دشمن کو کا
 مولیٰ کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔“

”ہاں۔“ میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ”میں ایک فوجی ہوں۔ کوئی پیشہ

قائل نہیں ہوں کہ بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا پھروں۔ میدان جنگ کی بات نہ کرو۔ وہ اور بات ہوتی ہے۔“

اس کا منہ اس طرح بن گیا جیسے کڑوا بادام کھا لیا ہو۔ ”میرے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔“

اس کے جواب اور ٹھکرانے میرے تن بدن میں آگ بھردی۔ میں نے اپنے منہ کو ضبط کرنا چاہا مگر میرے لیے کتنی جھجھی نہیں رہ سکی۔ میں نے کسی قدر تندر لہجے میں کہہ "اگر آپ کو دونوں کا فرق معلوم نہیں ہے تو براہ کرم ایک فوجی کے سامنے اپنی زبان بند رکھیں۔ فوجی وطن کی حفاظت کرتا ہے۔ وطن عزیز کی خاطر دشمن کیا کر بیٹا بھی خدا ربین جائے تو اسے بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کر سکتا۔ ہمیں صرف وطن کا مفاد عزیز ہوتا ہے جبکہ ایک قاتل محض اپنے ذاتی مفاد کے لئے قتل جیسے ہر ممکن جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔"

میرے تیز و تند اور نفرت بھرے لہجے کا اس نے کوئی اثر نہیں لیا۔ اس نے بڑی خاموشی اور ضبط و تحمل سے میری باتوں کو سنا تھا۔ پھر اس نے نہایت ہی پُر سکون آوازیں کہا۔ ”وہ عورت بھی سفاک اور وحشی ہے۔ اس نے گاؤں والوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ تم اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے اس گاؤں کے ہزاروں باشندوں پر احسان عظیم کرو گے۔“

”اگر وہ عورت واقعی ایسی ہے تو لوگ قانون کا سہارا کیوں نہیں لیتے ہیں؟“ میں نے جھنڈا کر کہا۔

”وہ عورت نہ صرف بے حد دولت مند ہے بلکہ اس قدر اثر و رسوخ رکھتی ہے کہ کوئی بھی اس پر ہاتھ ڈالے گی جرات نہیں کر سکتا ہے۔ اس علاقے میں اس کی حکمرانی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”پھر تو یہ نیک فریضہ کوئی بھی پیشہ ور قاتل انجام دے سکتا ہے۔“ میں نے طنزیہ

”میں اپنے فیصلے پر اٹل رہوں گا۔“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”دس لاکھ روپے میں بھی میں جکے والا نہیں ہوں۔“

”سنو بر خوردار!“ اس کے لیے کاظم میرے لئے زہر بن گیا۔ ”تم اس وقت میری معافی میں ہو۔ میں تمہاری زندگی کا ایک لمحہ عذاب بنا کر رکھ دوں گا۔ تمہیں انہیں سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں مل سکے گی۔ قانون کی نظروں میں تمہارا کردار داغدار ہے۔ میں جب اور جس وقت چاہوں تمہیں تختہ دار تک پہنچا سکتا ہوں۔“

میں اس لمحے بدحواس ہو گیا لیکن میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ فوراً ہی سنبھل گیا۔ قتل تو کیا یہی شخص میرا انجانہ دشمن ہے؟ میں نے دل میں سوچا۔ پھر میں نے بڑی بے پروائی کے انداز میں کہا۔ ”میں ان گیدڑ بھجکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ تم چاہو تو میری آزانکش کرلو۔“

وہ ذریعہ مسکراہٹ کے ساتھ کرے کے ایک گوشے کی طرف بڑھا جہاں ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس نے میز کی دراز میں سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ”اسے دیکھ لو۔ شاید تمہیں اپنا فیصلہ تبدیل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔“

میں نے متحجب ہو کر اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔ اس میں میرے لئے موت کا پردہ رکھا ہوا تھا۔ اس میں ان دونوں اعتراف ناموں کی فوٹو شیٹ کاپیاں موجود تھیں جو بلاوجہ میری زندگی پر بدنام داغ بن گئے تھے۔ تیسری چیز وہ تصویر تھی جو مجھے چھانی کے پھندے تک پہنچا سکتی تھی۔ تصویر اٹارنے والے نے واقعی اپنے کمال کا ثبوت دیا تھا۔ اس میں مجھے نہایت بے دردی سے ایک شخص کی جینے میں جھرا گھونٹے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی میرے قاتل ہونے میں شبہ کر سکتا تھا۔

میرے پورے بدن میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اس کی طرف فضا بن کر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو تم وہی شخص ہو جو قدم قدم پر میرے لئے ہال بھجارتا تھا؟“

لہجے میں کہا۔ ”ڈھاکہ شرمیں ایسے قاتلوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ ہزار دو ہزار ٹاکسیر اپنے ہاتھ بھائی کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔“

اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”خطرناک ترین پیشہ ور قاتلوں کو اس مشن پر روانہ کیا گیا تھا مگر آج تک ان لوگوں کا نام نشان نہیں ملا۔ اب کوئی بھی وہاں کسی قیمت پر جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جبکہ تیر انہیں منہ ماکا محالہ دینے کے لئے بھی تیار تھا۔“

”یہ کتنے عرصے پہلے کی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”کوئی ایک سال ہوا ہو گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس عورت کا ظلم و ستم روز بروز ہتھی چارہا ہے۔“

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”سنئے جناب!“ میں نے ادریس الحن کو مخاطب کے تقریر کے انداز میں کہا۔ ”میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر ہوں اور اپنی بقیہ زندگی سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔ میں اس دولت کی خاطر کانٹوں پر کیسے چل سکتا ہوں جو کسی وفا میں کرتی۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ دولت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک جانی چیز ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”دولت ہی اس عہد کا خد ہے۔ دولت کے بغیر زندگی میں کوئی حسن نہیں، کوئی دلکشی نہیں ہے۔“ اس کے بغیر ہر شخص اپنا ہے بلکہ اپنا ہے اپناج سے بھی بدتر ہے۔“

”نیک ہے۔“ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی طرف بے پروائی کے انداز سے دیکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔ ”مجھے اپناج بن کر زندگی گزارنا پسند ہے۔“

”ایک منٹ کے لئے رک جاؤ۔“ اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ”میں تمہیں سوچنے کے لئے دو تین دن کی حسمت دیتا ہوں۔“

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اس لاش کو کہاں سے کھوج کر قانون کے حوالے کرو گے؟ ہر حال یہ مسئلہ تو بہت بعد میں آئے گا۔ فی الوقت میں تمہیں یہ بتانے جا رہا تھا کہ اس رات گیس سپرے کر کے تمہیں گمری فینڈ سلا دیا گیا۔ اس طرح اصلی چاقو پر تہلری اٹھیں گے نشانہ لے لئے گئے۔“

”اوہ میرے خدا۔“ میرے منہ سے بے اختیار ایک طویل سانس نکل گئی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ میں اس دن اتنی دیر تک کیوں سو رہا تھا جبکہ میری شروع سے ہی یہ عادت تھی کہ فجر کی اذان کے وقت بیدار ہو جایا کرتا تھا چاہے رات کتنی ہی دیر تک کیوں نہ جاگتا رہوں۔ میں بے حد سنجیدگی سے اس معاملے کے حواقب پر غور کرنے لگا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو اس قدر بے بس محسوس کیا کہ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ ”آپ پیٹنگی رقم ادا کر دیں۔“

ادریس الحق کا چہرہ میرا فیصلہ سن کر دکھ اٹھا۔ اس نے میز کی دراز سے ایک بڑا سا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں ایک لاکھ کی رقم موجود ہے۔“ میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں سو اور پانچ سو ٹاکا کے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ میں نے لفافہ ہاتھ میں نہاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تمہیں اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ میں یہ رقم حاصل کرنے کے بعد کہیں بھی آسانی سے فرار ہو سکتا ہوں۔ کوئی مجھے انڈیا بھی نہیں کر سکے گا۔“

ادریس الحق معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”ہم نے تمہارے بارے میں اچھی طرح جان بین کر کے ہی یہ مشن تمہارے سپرد کیا ہے۔ ہم نے کچی گولیاں نہیں کھلی ہیں۔“

”تمہیں میری ذات پر اس قدر مجبور ہے؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔“ اس کی آنکھیں چپکنے لگیں۔ ”تم اس مشن میں اس لئے بھی دلچسپی لو گے کہ وہ جگہ کبھی تمہارے دل کی دھڑکن رہی ہے۔“

”بہت خوب۔“ میں زیر لب مسکرا دیا۔ پھر میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔

اس کے خشک لبوں پر خشکی سی خشکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اس وقت جو چاہو سمجھ لو۔ یہ تو وقت بتانے کا کہ تمہارا دشمن کون ہے؟ بہتر ہے کہ اب ان فضول باتوں میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔ تم انکار کرنے کا انجام سمجھ ہی گئے ہو۔“ اس نے لحاظی تامل کے بعد میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا عظمیٰ کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ میری پیشکش قبول کر لی جائے؟“

”مگر.....“ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میرے لئے یہ راستہ بھی موت کے مترادف ہے۔“

”نہیں..... یہی ایک راستہ ایسا رہ جاتا ہے جس پر چل کر تم پھانسی کے پھندے سے بچ سکتے ہو۔“ اس نے سپاٹ انداز سے کہا۔ ”مشن کے مکمل ہونے پر یہ تینوں داغ تمہارے دامن سے دھو دیئے جائیں گے ورنہ دوسری صورت میں.....“ اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھر اوروں پر چھوڑ دیا۔

”قانون اندھا ضرور ہے۔“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”لیکن وہ ایک بے گناہ کو ضرور محفوظ دے گا۔“

”یہ تمہارا وہم ہے۔“ اس کے چہرے پر کمرہ ہنسی پھیل گئی۔ ”ہمارے ملک میں انسانوں کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اس قانون میں صرف محسوس ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ کتنے بے گناہ انسان اس قانون کی دجہ سے پھانسی کے پھندے تک پہنچ جاتے ہیں۔ تم بھی ان میں سے ایک ہو گے۔ ہمارے پاس صرف یہ تصدیق ہی نہیں بلکہ وہ چاقو بھی موجود ہے جسے دنیا کی کسی بھی عدالت کے سامنے ایک ناقابل تردید ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس چاقو پر تہلری انگلیوں کے نشان بھی موجود ہیں۔“

”وہ کس طرح؟“ میں نے حیر زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا وہ چاقو نفی نہیں تھا۔“

”یقیناً نفی تھا۔“ اس نے حاشیگی سے جواب دیا۔ ”وہ قتل بھی ایک ذمہ دار تھا لیکن

”کون سی جگہ ہے وہ؟“

”حسن پور۔“

”حسن پور؟“

مدے معاملے کا پس منظر کچھ اور سی ہے۔ وہ اصل بات گول کر گیا ہے۔ اس نے تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھایا ہے۔ بہر حال اب مجھے گاؤں تو جانتی تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہی سارے حقائق میرے علم میں آ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں آنکھ بند کر کے اور ایس الحق کی بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ یہ شخص مجھے معتبر نہیں لگا تھا۔

میں نے قدرے توقف کے بعد اور ایس الحق سے پوچھا۔ ”اس عورت کا نام کیا ہے؟“

”عالیہ۔“

”عالیہ؟“ میں نے زیر لب دہراتے ہوئے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ میری یادداشت میں آج بھی اپنے گاؤں کی بہت سی عورتوں کے نام موجود تھے لیکن کوشش کے باوجود میرے ذہن میں عالیہ نامی کسی عورت کا تصور نہ ابھر سکا۔ اس نام کی کوئی عورت وہاں نہیں تھی۔

”کیا اس عورت کا تعلق اس گاؤں سے ہے یا وہ کہیں اور سے آئی ہوئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اس گاؤں کی عورت نہیں ہے۔“ اور ایس الحق نے جواب دیا۔

”آپ کے پاس اس عورت کی کوئی تصویر تو ہوگی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اتفاق سے اس کی کوئی تصویر میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میں نے اس کی کوئی ضرورت سمجھی۔“ اور ایس الحق نے کہا۔ ”مگاؤں پنچو کے تو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اس نے حویلی خرید کر اس میں رہائش اختیار کر لی ہے۔“

☆-----☆-----☆

میں نے ایشیا پر پینتالیس پور کا ایک امریکن ریو اور خریدار جو حال ہی میں بازار میں آیا تھا۔ یہ ریو اور خاصا قیمتی تھا مگر اتنا ہی خطرناک بھی۔ یہ جدید ترین تھا۔ اسی سال حصارف کرایا گیا تھا۔ میں نے احتیاطاً سو گولیاں بھی ساتھ خرید لیں اور دونوں چیزیں کافد

میں اپنے گاؤں کا نام سن کر اچھل پڑا تھا؟ آج بھی میری سانسوں میں اس گاؤں بڑاس رہی ہوئی تھی۔ میں نے جوانی کی حدود تک وہاں پُر کیف زندگی گزاری تھی۔ کبھی بھی مجھے اپنے گاؤں کی یاد آتی تھی تو میرا دل سینے میں بری طرح دھڑکنے لگتا تھا میری بے شکریادیں اس کے گوشے گوشے اور بچے بچے سے وابستہ تھیں۔

تاہم یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ حسن پور جیسے گاؤں میں کسی عورت کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟ آخر وہ کون عورت ہے جو اس گاؤں پر حکمرانی رہی ہے؟ اس نے گاؤں کے باشندوں کو کس بنیاد پر ظلم و ستم کا نشانہ بنارکھا ہے؟ اور دروازہ اور پسماندہ گاؤں میں کوئی سونے کی کان بھی نہیں ہے۔ وہ ایک گمناں سا گاؤں ہے۔

مجھے اس عورت کے تذکرے میں داستان طرازی کا گمان ہونے لگا۔ اچانک اور خیال میرے ذہن میں سرسرایا۔ آخر وہ کون لوگ ہیں جو گاؤں والوں کو اس عورت سے نجات دلانا چاہتے ہیں؟ اور پھر اس کی موت کے لئے پیسہ پانی کی طرح ہمارے ہیر توڑی دیر بعد یہ خدشات سوال بن کر میری زبان پر آ گئے۔

اور ایس الحق نے میرے خدشات کو بڑی سنجیدگی سے سنا اور کسی قدر توقف کے کہا۔ ”اس ملک میں چند ایسے خداتر سبندے بھی موجود ہیں جو ظلم و ستم کی کہانیاں کر گاؤں والوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اس عورت سے عاجز آ گئے ہیں انہیں اس عورت سے جب ہی نجات مل سکتی ہے جب اس کے وجود سے دنیا کو پاک دیا جائے۔“

اور ایس الحق کی بات میرے دل میں بیٹھ نہیں سکی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ

کے لٹافے میں رکھ کر ایک ایسا بڈل بنالیا کہ دیکھنے والے کو گمان نہیں گزر سکتا تھا کہ اس بیکٹ میں کیا چیز موجود ہے۔ میں نے چند جوڑے کپڑوں کے رکھ کر کچھ روپو اور والی بیکٹ چھپا دیا۔ مزید کچھ تیار یوں کے بعد میں دوسرے دن رات کے وقت سینٹر کے ذریعہ بارہال روانہ ہو گیا۔ مجھے بارہال پہنچ کر حسن پور کے لئے لالچ لیتا تھی۔ کوئی سنبھالا، براہ راست بمبلی سے حسن پور نہیں جاتی تھی۔ حسن پور بارہال سے سو میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔

☆-----☆-----☆

سنبھیر میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو میری نیند جیسے اڑ گئی تھی۔ میرا دل پیش آنے والے واقعات کا سوچ سوچ کر دھڑکنے لگا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات کی ایک پورش سی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ایک عورت کو کس طرح سے قتل کر سکوں گا۔ میں نے کبھی قتل و غارتگری میں حصہ نہیں لیا تھا۔ میدان جنگ کی بات اور تھی۔ ایک عورت کو قتل کرنا کوئی بھاری کام نہیں تھا۔ ایک احساسی جرم میرے پیروں میں جھیناؤں ڈال رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حالات مجھے اس بڑی طرح اپنے کٹھن میں جکڑ لیں گے کہ میں ایک عورت کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ میرے مقابلے پر کوئی مرد ہوتا تو شاید میں اس انداز سے نہ سوچتا۔ مگر وہ ایک عورت تھی۔ کیا ایک عورت واقعی اس قدر ظالم بھی ہو سکتی ہے کہ اسے صفحہ ہستی سے مٹانا اشد ضروری ہو جائے؟

صبح بارہال پہنچا تو معلوم ہوا کہ حسن پور کے لئے لالچ شام کے وقت جاتی ہے۔ میں نے سہ پہر تک کا وقت بارہال میں محوم بھر کر گزارا اور لالچ کی روائی سے ایک گھنٹہ قبل گھاٹ پر پہنچ گیا۔ گھاٹ پر بہت سے لوگوں کا جھوم تھا۔ اس جھوم میں میری نظر چار آدمیوں پر پڑی جن کی حرکات و سکنات کسی قدر بے اسرار اور مشتبہ سی تھیں۔ وہ چاروں ایک گوشے میں کھڑے ہوئے تھے اور ان کی معنی خیز نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں لالچ

کے انتظار میں ادھر ادھر ٹھہرنے لگتا تو ان کی نظروں کو اپنے تعاقب میں پاتا تھا۔ جیسے وہ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دینا چاہتے ہوں۔ وہ مجھ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں اپنا شک دور کرنے کے لئے انہیں پتھر دے کر ایک قریبی ہوٹل میں جا چھپا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے انہیں بدحواسی کے عالم میں سڑک پر ادھر ادھر بھٹکنے ہوئے پایا تھا۔ ان کے چروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ شاید میں ان کا شکار تھا۔

مجھے اندیشوں نے گھبرا شروع کیا۔ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ کہیں یہ اور بس الحق کے ساتھی تو نہیں جو مجھ سے ایک لاکھ روپے بچھن لینے کے لئے میرے تعاقب میں لگ گئے ہیں مگر روپے بچھنے کے لئے انہیں اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اسی دن اور رات میرے گھر پر دھاوا بول سکتے تھے جب میں رقم لے کر گھر پہنچا تھا۔ یہ لوگ اس قدر احمق بھی نظر نہیں آتے تھے کہ رقم کی غرض سے بارہال آ جائیں۔ پھر اس امر سے سب واقف ہیں کہ کوئی بھی شخص اتنی بڑی رقم اپنی جیب میں لے نہیں پھرتا۔ میں نے وہ رقم بیک میں ایک فرضی نام سے اکاؤنٹ کھولا کر محفوظ کر دی تھی۔ میری جیب میں اس وقت ایک ہزار روپے تھے۔ مگر جس ملک میں مفلسی اور غربت چاروں طرف پھیلی ہوئی ہو وہاں ایک ہزار کے لئے بھی قتل ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن انجانے دشمن کی طرف چلا گیا۔ اور بس الحق کی باتوں سے میں نے قیاس لگایا تھا کہ میرے انجانے دشمن نے میرے راز اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں۔

اور بس الحق اور اس کے درمیان کوئی ساز باز ضرور تھی یا پھر وہ دونوں ہی میرے خلاف سرگرم عمل تھے۔ میرے دشمنوں کے دل سے شاید ابھی بھڑاس نہیں نکلی تھی اس لئے وہ مجھے مزید ڈک پہنچانے پر تلے بیٹھے تھے اور انہوں نے چار بد معاشوں کو میرے تعاقب میں لگا دیا تھا۔ اب حسن پور تک میرے ساتھ کس قسم کے واقعات پیش آئیں گے، اس کے بارے میں مجھے قطعی کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن اس بات کا خوف و خدشہ تھا کہ وہ کچھ

نہ کچھ میرے ساتھ ضرور کریں گے۔ اس کے لئے مجھے چوکنار اور ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔

سلطانہ نالی لالچ حسن پر جاتی تھی۔ وہ اپنے وقت پر آگئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسافروں سے کچھ کچھ بھر گئی۔ میرا ارادہ اول درجے سے سفر کرنے کا تھا مگر ان بد معاشوں کی وجہ سے میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور تیسرے درجے میں غصہ خٹا کر بیٹھ گیا۔ اس طرح میں وقتی طور پر خطرات سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اتنے مسافروں کے درمیان وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔

اس درجے میں کسی قدر جس اور ٹھکن کی کیفیت تھی مگر لالچ چلتے ہی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں لالچ کا زیریں حصہ فرحت بخش بن گیا۔ وہ چاروں کسی منصوبے کے تحت میرے تعاقب میں تھے۔ وہ چاروں باری باری زیریں گشتے میں آکر ایک پکر لگاتے اور میری طرف مسترخانہ مسکرہٹ اچھالتے ہوئے دوبارہ اوپر چلے جاتے۔ مجھے ان کے بار بار پکر لگانے کی وجہ سے ہنسی بھی آ رہی تھی۔ انہیں جیسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں میں کھڑی سے پانی میں چھلانگ لگا کر ان کے ہاتھ سے نہ نکل جاؤں۔

لالچ ساری رات چلتی رہی۔ صرف دو تین گاؤں پر کچھ دیر کے لئے رکی تھی۔ میں ایک ہل کے لئے بھی نہیں سو سکتا تھا۔ ساری رات میرے ذہن میں خوف و ہراس کے ہادل جھمکے رہے اور اندیشے ذریعہ پہ ساہیوں کی طرح لہراتے اور ڈٹے رہے تھے۔ میں اپنے دشمنوں سے عاقل رہ کر انہیں کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ میری جان کے دشمن نہیں ہیں۔ کہہ سکتے تھے قتل کرنا ان کے لئے قطعی دشوار نہ تھا۔ البتہ وہ مجھے کسی سنگین واقعے میں ملوث کر سکتے تھے تاکہ میں اس میں ایسا پھنس جاؤں کہ نکل ہی نہ سکوں۔ انہوں نے رات کے وقت بھی میری عمرانی کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے آکر نیچے جھانک جاتے تھے۔

وقت گزاری کے لئے میں نے اپنے گاؤں اور عالیہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہ صورت میرے لئے ایک معرکہ بنی ہوئی تھی۔ بہر حال اب گاؤں پہنچ کر ہی اس مسئلے میں کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا۔ میرے لئے یہ بات بھی خاصی تعجب خیز تھی کہ اس لئے رہائش کے لئے ایسی حویلی کا انتخاب کیوں کیا جواؤں میں آسپ زدہ مشہور تھی اور وہیں سے دیران پڑی ہوئی تھی۔ میں اپنے بچپن کے دنوں میں اس حویلی کے بارے میں طرح طرح کے قصے اور کہانیاں سنا کرتا تھا۔ انہی میں سے ایک حکایت یہ بھی تھی کہ اس حویلی کو ہندوستان کی ایک ریاست کے مہاراجہ نے تعمیر کیا تھا۔ پھر تحریک آزادی اور انگریزوں کے استحصال سے خوفزدہ ہو کر اس حویلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی لمبی بیویاں اور دوس لڑکے تھے۔ لڑکوں کی شادی کے بعد مہاراجہ دنیا سے ہمیشہ کے لئے مدعا کر گئے۔ اپنے پیچھے انہوں نے بہت بڑا خزانہ چھوڑا تھا۔ اس خزانے کی تقسیم نے مہاراجہ کے بیٹوں اور بیویوں میں باہمی چپقلش پیدا کر دی اور ایک دن ایسا خون خرابہ ہوا کہ پوری حویلی اجڑ کے رہ گئی اور پھر کبھی آباد نہ ہو سکی۔ روایت کے مطابق مہاراجہ کا سب سے چھوٹا بیٹا اس خون خرابے سے محفوظ رہا تھا۔ کہہ سکتے تھے کہ وہ ان دنوں لندن میں زیر تعلیم تھا۔ کئی برس کے بعد وہ کلکتہ واپس آکر وکالت کے پیشے سے شغف ہو گیا۔ تاہم اس نے کبھی گاؤں آکر اپنے باپ کی نشانی کو دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ یہ حویلی آہستہ آہستہ آسپ زدہ مشہور ہو گئی۔ ویسے بھی حویلی گاؤں کے انتہائی سرے پر آبادی سے اس قدر دور تھی کہ کوئی اس طرف پہنچنا بھی نہیں تھا۔

صبح ہوئی تو میرا خوف و ہراس کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ معاش مجھ پر ہل نہیں بول سکتے تھے۔ وہ دن بھی بغیر کسی مصیبت کے گزر گیا۔ جب لالچ چاند گھر پہنچی تو سرنی شام پہنچی ہوئی تھی۔ اب پھر دو محض تین منٹ کے فاصلے پر وہ گیا تھا۔ چاند عمر میں لالچ تقریباً غلط ہو گئی تھی۔ میں زیریں حصے میں اکیلا تھا اور اپنی افسردہ پر بیٹھا ہوا دھڑکنے والے ساتھ اپنے گاؤں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اٹھارہ

☆-----☆-----☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے سر کے زخم میں درد کی ہلکی ہلکی نیپیں اٹھتی ہوئی محسوس کیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک لطیف سی مسک میرے حواس پر چھانے لگی۔ اس مسک نے کسی حد تک میری تکلیف کے احساس کو کم کر دیا تھا۔ میں نے چند لمحوں کے بعد اپنی منوں بھاری پلکیں اٹھا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ چند ثانیوں میں دھند چھٹ گئی۔ میں نے اپنے اوپر سولہ سترہ سال کی لڑکی کو جھکا ہوا پایا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ قدرت بعض جگہ ایسی توجہ سے تراشتی ہے کہ اس میں کوئی عیب اور کمی نہ رہ جائے۔ اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے لالہ سیاہ بال بتا رہے تھے کہ وہ ابھی ابھی نما کر آئی ہے۔ ایک دلفریب خوشبو اس کے گیسوؤں سے بھوت رہی تھی۔ اس کی پیشانی شبلی اور فراخ تھی۔ بھنورے جیسی سیاہ آنکھوں میں ہمیل سی کمرائی تھی۔ اس کی نگاہیں میرے ہاتھ کی بندھی ہوئی پٹی پر مرکوز تھیں۔ میں نے اس کے حسین چہرے پر فکر مند کی کے آثار دیکھے۔ محاسن کی نگاہیں میرے چہرے کی طرف اٹھیں۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چراغ جلنے لگے اور دھندلوں پر سرخی پھیل گئی۔

اس نے دیکھتے چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بتا شایعے میں میں پوچھا۔ ”آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”نیک ہوں اور زندہ ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور مجھے اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میں نے اپنا ہاتھ بے اختیار زخم کی طرف بڑھانا چاہا۔ کیونکہ اس میں درد کی لہر اٹھی تھی۔ لڑکی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے پھول جیسے نرم و نازک ہاتھ کے لمس سے میرے بدن میں جیسے اپنا بتانے کے بے پایاں جذبے کی فرحت سراپت کر گئی۔ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو شاید میں اس کے ہاتھوں میں بھی لمس کا ایسا ہی راحت انگیز سرور

برس کا عرصہ کس قدر طویل ہوتا ہے۔ مجھ پر جذبات کی کیفیات ایسی طاری ہوئیں اپنے ارد گرد کا ہوش بھی نہیں رہا۔ میں اس وقت چونکا جب چاروں بد معاش غاموش۔ نیچے آکر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میری غفلت کے باعث انہیں مجھے گھیرا موقع مل گیا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں رہا تھا کہ دستی بیک سے ریوالتوں نکالوں۔

وہ چاروں میری طرف بڑھنے لگے۔ ان کے چہروں پر درد نگہ اور سفاکی چھائی تھی۔ لالچ بک رفتاری سے حسن پوری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انہی کا شور اس قدر کو رہا تھا کہ عود کے لئے چننا بھی لاحاصل تھا۔ تاہم میں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہر نہیں کیا۔ میں نے خود پر قابو پایا ہوا تھا۔ میں ان چاروں سے مقابلے کے لئے اپنے آپ پوری طرح تیار کر چکا تھا۔

چند ثانیوں کے بعد وہ چاروں بد معاش مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ایک بد معاش تو فوراً ہی ڈھیر کر دیا تھا۔ میرا مکان اس کے پیٹ میں لگا تھا۔ وہ تڑپ کر اور پیچ مار کے پراوند سا کر پڑا۔ فرش نے اس کی کھوپڑی بجا دی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر اشتعال میں آگئے۔ ان میں سے ایک بد معاش نے میرے پیچھے آکر مجھے اس بڑی طر جکڑ لیا کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ یقیناً وہ بد معاشوں نے مجھ پر لالٹوں اور گھونٹوں پادش شروع کر دی۔ ان کی ضربوں سے میرے جسم کا کوئی حصہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس بد معاش کے ٹھٹھے میں اس بڑی طرح جکڑا ہوا تھا کہ نکلنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ بس میرے منہ سے دلخراش چیخیں اُڑ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر غنود طاری ہونے لگی۔ میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اچانک ہی ایک بد معاش نے کسی سخت چیز سے میرے سر پر بھر دار کیا۔ ساری دنیا مجھے پتھر کھائی ہوئی نظر آنے لگی اور میں تارکیوں میں ڈوبنے لگا دوسرے لمحے میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

کر مغربی سمت کی کھڑی کھول دی۔ ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا اندر آیا۔ میں نے کھڑکی کی راہ سے صاف شفاف آسمان کو دیکھا۔ باہر سنہری دھوپ چمکی ہوئی تھی۔ میں یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ دن کس قدر چڑھ آیا ہے۔ میں نے بولنا چاہا مگر پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس سے پانی مانگا۔ وہ تیرکی طرح کمرے سے لٹکی اور فوراً واپس آگئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا بڑا سا پیالہ تھا۔ میں نے پانی پینے کے لئے اٹھنا چاہا تو سارے بدن میں درد کی لرزہ پھیلی گئی۔ میں بے حس و حرکت پڑا رہ گیا۔ میرے بدن کا جو ڈرود کر رہا تھا۔ لڑکی نے مسہری پر چڑھ کر پیالہ میرے سرہانے کے قریب رکھا اور دو زانو ہو کر میرا سراپے زانو پر رکھ کر اور پیالہ اٹھا کر میرے خشک ہونٹوں سے لگا دیا۔

مٹھڑے پانی کے گھونٹ میرے حلق کو تر کرتے ہوئے جسم میں اترنے لگے۔ میں جیسے کوئی امرت پی رہا تھا۔ میرے جسم میں طاقت عود کر آئی۔ میں نے سیر ہو کر پانی پیا۔ راحت کا احساس میرے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ پانی پلانے کے بعد اس نے میرا سر آہستہ سے اٹھایا۔ میں نے اس پل اپنی آنکھیں بند کر کے سوچا۔ اگر میری جہنم ہوتی تو شاید وہ بھی اسی طرح میری خدمت کرتی۔ مجھے اپنی اس زندگی پر بچتا ہوا ہونے لگا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔ میں نے اٹھنا گھبراہٹ کی طرح کیوں نہیں کیا۔ لوگ اس لئے تو شادی کرتے ہیں کہ شادی چڑوں اور مچھلیوں کو پانے کا راستہ ہے۔ ان کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں اور کتنے چراغ جل اٹھتے ہیں۔ ان چراغوں کو بجھانے کے لئے کتنے طوفان آتے ہوں گے، کیسی کیسی آندھیاں زمانے کی حرارت بن کر اٹھتی ہوں گی لیکن ماں باپ ان طوفانوں کے آگے سینہ سپر ہو جاتے ہیں تاکہ یہ چراغ بجھنے نہ پائیں جن سے ان گھروں میں زندگی ہے، رونق ہے، بہاریں ہیں، حسن ہے۔ شاید اسی جذبے کا ہم موت، ماسٹا اور شہقت ہے۔

میں نے آنکھیں کھول کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے اور

محسوس کرتا۔ کیا لطیف سانس تھا۔ میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک انوکھے اور انمول جذبے سے آشنا ہوا تھا۔ میں اپنا دوا در دوا زخم کی نیلیں بھول گیا تھا۔ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ میری رگ رگ میں اس لڑکی کے لئے انجانی محبت کا جذبہ ایک طوفان بن کر پھرنے لگا تھا۔

”نہیں..... نہیں، آپ ہاتھ نہیں لگائیں۔“ اس کی جمیل سی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔ اس نے جل ترک جیسی آواز میں کہا۔ ”جناب! زخم ابھی بھرا نہیں ہے۔ کچا ہے۔ آپ کو اپنا بڑا خیال رکھنا ہو گا۔“

میں نے اپنے اندر بڑی فضا محسوس کی۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے نازک ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جیسے کوئی فرحت کا خزانہ تھا۔ جو میرے زخموں میں بجلی کی لہروں کی طرح سرایت کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا اگر وہ میرے ہاتھ کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں لئے چند گھنٹے بیٹھی رہی تو زخم جلدی مندلی ہو جائیگا۔ اس نے چند لمحوں کے بعد میرا ہاتھ آہستہ سے میرے سینے پر رکھ دیا۔

میں نے ہل بھر کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرے زخم میں دوبارہ نشیمر اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے پھر اپنی آنکھیں کھول کر چھرائی ہوئی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک مستطیل کمرہ تھا۔ دروازے کے پاس ایک بڑی سی چوکی پر سرخ رنگ کی درو اور چاندنی بچھی ہوئی نظر آئی تھی۔ کمرے کے بیرونی دروازے کے عین سامنے لمبو چوڑی مسہری دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی جس کے نرم دو گنا زاور بے حد آرام دہ بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ لڑکی مسہری پر میرے پاس دو زانو ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔

کمرے میں کسی قدر صحت اور صحت مند سی تھی جبکہ کمرہ بے حد کشادہ تھا۔ میرے چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھرنے لگیں۔ باہر بھی شاید شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ اس نے میرے بے چینی محسوس کر لی اور پھر اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ میرا چہرہ سینے میں تر ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی ساڑھی کے پلو سے میرے چہرے کا ہینہ صاف کیا اور مسہری سے اڑ

اگھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ساری زندگی؟ وہ کس لئے؟“ اس کے حسین چہرے پر مصومیت نکھر گئی۔

”اس لئے کہ اس ریاکاری اور منافقت کی دنیا میں کسی شخص کو بیٹی جیسا تدار ملے
اواہاں سے چانکیے پسند کرے گا؟“

”اوہ۔“ وہ دلکش انداز میں مسکرا دی۔ ”کیا آپ کی کوئی بیٹی نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے ادا سی سے جواب دیا۔ ”میں شادی شدہ ہوتا تو شاید تم جیسی
میں چار بیٹیاں ضرور ہوتیں۔“

”کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کی بیٹیاں ہوتیں۔“ اس نے گفتگو سے کمال۔ ”شاید
کے بیٹے ہی بیٹے ہوتے۔ کیوں؟“

”بجائے میں کوں سا ایسا گھر ہے جہاں بیٹیاں نہیں ہیں۔ اس لئے میں بھی کئی ایک
گاپ ہو گا۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ اس نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ”اچھا تو آپ مجھے اپنی بیٹی
سمجھیں۔ ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا نام ہے ہماری بیٹی کا؟“
”پوین۔“ اس کے لیے میں ہلکی سی شوخی آگئی۔ ”لیکن مجھے بھی پادرو کہہ کر
تے ہیں۔ آپ بھی پادرو کہہ کر لے سکتے ہیں۔“

”نام بھی تسمدی طرح پیارا ہے۔“ میں بولا۔ ”میں تمہیں پادرو کے نام سے ہی
ادوں گا لیکن مجھے اس گھر میں تسمدے سوا کوئی اور نظر نہیں آیا۔ تسمدی امی ابو کہاں
ہا؟ تم کتنے بھائی بن گئے؟“

”میرے ابو؟“ اس کا لہجہ یکسر بدل گیا۔ اس کا چہرہ بھی جھگ گیا۔ اس کی بڑی بڑی
اگھوں سے ادا سی جھانکنے لگی۔ وہ اپنا خوشامرلا تے ہوئے افسردگی سے بولی۔ ”آپ
مجھ لیس کہ میرے ابو نہیں ہیں۔ کوئی بھائی بن بھی نہیں ہے۔ میری صرف ایک

مسکراتے ہوئے پایا۔ میں بھی جواباً مسکرا دیا اور اس سے پوچھا۔ ”میں کہاں ہوں؟“
اس کے رخسار دنگے لگے۔ وہ آہستہ سے بولی۔ ”میرے گھر میں۔“

میں اس لڑکی کے گھر میں کس طرح اور کیوں کر پہنچا جسے اس کی کچھ خبر نہ تھی
قلبی کہانی کی طرح میں ایک اجنبی اور پیاری سی لڑکی کے گھر میں تھا میں نے اس
سوالات کی پوچھاڑ کر دی۔ ”کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ مجھے ان خطرناک بد معاشوں سے
لے بچایا؟ یہاں مجھ کو لے کر آیا؟ وہ بد معاش لوگ کہاں ہیں؟“

”میں اپنی لالچ میں ادھر سے گزر رہی تھی کہ اچانک میری نظر مسافر لالچ
زیریں حصے پر پڑی۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ ”میں نے دیکھا چار بد معاش مل کر
کو بڑی طرح مار رہے ہیں۔ آپ کو پٹنے ہوئے دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اپنی
کارخ اس لالچ کی طرف موڑ لیا۔ جس وقت میری لالچ قریب پہنچی اس وقت آپ
ہوش ہو چکے تھے اور ان بد معاشوں نے آپ کو ندی میں پھینکنے کے لئے اٹھار کھاتھا۔
اور میرے ساتھ جو مرد تھے جنہیں میں نے لفت دی تھی شور مچا دیا۔ ان بد معاشوں
جب ہمیں دیکھا تو انہوں نے آپ کو فرش پر پیسنگ دیا اور ندی میں کود گئے۔ پھر وہ
جانے کس سمت تیزی سے اندر کی طرف تیرتے ہوئے نکل گئے۔ مجھے ان کی نہیں
کی فکر تھی۔ میں یوں بھی کسی شریف آدمی کے ساتھ ظلم ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی پھر
آپ کو شدید زخمی حالت میں اپنے گھر لے آئی۔ آپ کوئی دو دن تک مسلسل بے ہوش
رہے ہیں۔“

میں نے اس نیک اور عظیم لڑکی کو منون نگاہوں سے دیکھا میری آواز جذبے
سرشاری سے تھر تھرائی۔ ”میں تسمدیاہ احسان ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا۔“
”آپ مکمل صحت یابی تک میرے ہاں زیر علاج رہیں گے۔“ وہ زیر
مسکرائی۔ ”آپ اب اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔“

”اگر میں ساری زندگی یہاں رہتا چاہوں تو کیا رہ سکتا ہوں۔“ میں نے اس

بیدار کر گئی۔ اپنے نفس لب ولہجے، عادت و اطوار کی شانلنگی اور لباس کے سلیقے سے وہ کسی طرح بھی گاؤں کی رہنے والی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس میں ایک شہری اور تعلیم یافتہ لڑکی ہونے کی بھرپور جھلک تھی۔ اس کی اپنائیت میں ایک بے ساختہ پن تھا، اس میں کسی قسم کی کوئی جھجک نہ تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں ایسی مکمل ہوتی ہیں۔

کوئی ہفتہ بھر پارڈی گھرائی میں میرا علاج ہو تا رہا۔ اس نے بتایا کہ ہائی اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے نرسنگ کی تربیت حاصل کر لی تھی اور اس کے پاس ڈپلومہ بھی تھا اور اب وہ ڈھاکہ ایجن کالج سے انگریزی ادب میں ایم اے کر رہی ہے۔ وہ چنچوں میں اکثر کھانے کے پاس چلی آتی ہے۔ اسے شہر کے مقابلے میں گاؤں بہت اچھا لگتا ہے اور یہاں بڑا سکون سامتا ہے۔

میں اس کے لئے ایک انجینی مسافر کی طرح رہا۔ میں نے دانستہ اس سے عالیہ کے بارے میں نہیں پوچھا اور نہ ہی اس نے کبھی اس ظالم اور شیطان صفت عورت کا کوئی تذکرہ کیا۔ اسے میں نے اپنے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت دوس کی تھی۔ صرف میں نے اسے اتنا بتایا تھا کہ میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسروں اور بچے ایک دوست سے ملنے حسن پور آیا ہوں۔ میرے دل میں کئی بار یہ خیال آیا کہ اس سے کیوں نہ عالیہ کے بارے میں دریافت کروں۔ پھر کچھ سوچ کر یہ خیال ترک کر دیتا تھا۔ اس کی باتیں اس قدر سندر ہوتی تھیں کہ میں اس میں کھو کر رہ جاتا تھا۔

پارڈی شخصیت میرے لئے ہراساں اور ناقابل فہم سی ہو گئی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اب تک مجھے اس گھر میں پارڈے کے سوا کوئی اور فرد نظر نہیں آیا تھا۔ حتیٰ کہ میں ان عظیمی کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا تھا جو میرا علاج کر رہے تھے اور جن کے مطلب سے ہمارے لئے دوائیاں آتی تھیں ہاں، ایک بوڑھی ملازمہ ضرور تھی جو رات کے وقت ہماری کسی ضرورت کے پیش نظر میرے کمرے میں سوتی تھی لیکن وہ ہماری اور گونگی تھی۔ یہ گھر ایک اونچے نیچے پر بنا ہوا تھا جو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا تھا۔ اس کا

ای ہیں، وہی میری سب کچھ ہیں۔“

پارڈے کو اپنے باپ سے شاید کسی قدر جذباتی لگاؤ رہا ہو گا۔ اس لئے اس کے باپ کی جدائی کا غم ابھی تازہ تھا۔ شاید اس کے باپ کے ساتھ حال ہی میں کوئی ایسا حادثہ پیش آیا تھا جس نے ان کے درمیان دائمی جدائی پیدا کر دی تھی وہ اپنے باپ مرحوم اس لئے بھی نہیں کہتی ہو گی کہ ایسا کہتے ہوئے بہت تکلیف اور اذیت محسوس کرتی ہو گی۔ عموماً بیٹیوں کو اپنے باپ سے بہت پیار اور جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔

میں نے اس کے باپ کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا بہتر نہیں سمجھا۔ اگر انفرادی میرے دل پر خاصا اثر کیا تھا۔ میں نے موضوع بدلا اور پوچھا۔ ”تمہارا کہنا ہیں؟“

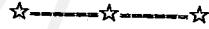
پارڈے کو جواب دینے میں کچھ تاہل سا ہوا تھا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے دیا۔ ”وہ باریاں اپنی ایک سیمپل کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لئے گئی ہوئی ہیں شاید کچھ دنوں بعد لوٹ کر آئیں گی۔“

”تم کس لئے شادی میں نہیں گئیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”جبکہ لڑکیہ شادی بیاہ کی تقریبات سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔“

”اس لئے کہ میرا موڈ نہیں تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور ہاں۔“ اچانک سراپہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں تو بھول ہی گئی تھی حکیم جی نے آپ سے اور کسی سے بھی زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا تھا آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے کہ آپ دو دن کے بعد ہوش میں آئے ہیں نا“ آپ بھوک سے غم حال ہو رہے ہوں میں تو آپ سے کھانے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔ باتیں بگڑنے پر بندھ گئی۔ آہی ویری ویری ساری..... میں ابھی آپ کے لئے دودھ اور توش لے کر آتی ہوں آپ کو دو چار روز تک سخت پرہیز کرنا ہو گا۔“

وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل گئی لیکن میرے اندر تجسس کا

رقبہ کم از کم ایک مربع فرلانگ ہو گا۔ ہر کرف یہ گھر بے حد بڑا سکون اور گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ ایک مریض کی صحت یابی اور اس کے آرام کے لئے بہترین جگہ تھی۔



میں نے پارو کو ایک بوٹ میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس نیلے سے دو تین میل کے فاصلے پر اطراف میں گاؤں، درخت اور چھوٹی چھوٹی پھاڑیاں تھیں۔ میں یہاں سے نکلتا بھی چاہتا تو مجھے کسی بوٹ یا کشتی کی ضرورت پڑتی پارو اکثر کہیں آتی جاتی رہتی تھی اس کی ماں ایک بار بھی مجھ سے ملنے نہیں آ سکی کیونکہ وہ اب تک گاؤں سے نہیں لوٹی تھی۔ میں نے اس سے بہت سی باتیں پوچھی تھیں لیکن اس نے بڑی خوبصورت سے ان کا جواب گول کر دیا تھا مجھے بھی ان باتوں سے کوئی خاص سروکار نہ تھا۔

میری توانائی بھی رفتہ رفتہ بحال ہو رہی تھی۔ میں کسی قدر تیزی سے رو بہ صحت ہونے لگا۔ میرے زخم بھی مندمل ہو گئے تھے۔ پارو نے مجھے بتایا تھا کہ حسن پور یہاں سے ہیں بچپن میں کے فاصلے پر ہے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے اس جگہ سے رخصت ہو جانا چاہئے۔ یہی کیا کم تھا کہ ایک اجنبی لڑکی نے خلوص و محبت کے انٹ جذبے سے میرا ایک باپ کی طرح خیال رکھا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ پارو مجھے باپ کی طرح چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے خاصی دیر تک باتیں کرتی رہتی تھی میں بھی اس کی رفاقت کا بے چینی سے شکر رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی میں یہ سوچ کر اداس ہو جاتا کہ کیا میں اس لڑکی سے دور رہ سکوں گا جس نے مجھے ایک انوکھے جذبے سے روشناس کرایا ہے۔ میں نے دل پر جبر کی سل رکھ کر اس سے اجازت چاہی تھی۔ اس نے مجھ سے مزید ایک دن ٹھہر جانے کی درخواست کی کیونکہ وہ بھی دوسرے دن ڈھاکہ شہر جا کر اپنی تعلیمی سرگرمیاں شروع کرنے والی تھی۔

اسے اس قدر پراسرار بننے کی کیا ضرورت تھی؟ اس مضموم سی لڑکی کو کس بات کا خوف دامن گیر تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے دشمن نے پروین کو مجبور کیا ہو کہ وہ مجھے یہاں پھینک جائے یا پھر میرے دشمن نے یہ حرکت کی ہو؟ پروین کو شاید اس واقعے کی ہوا بھی نہ گئی ہو؟ لیکن میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا لیکن میرا یہاں کھڑے رہ کر ان باتوں پر غور کر کے وقت ضائع کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ جو نہیں ہوتا تھا وہ چکا تھا اور پھر اب شام ہو چکی تھی۔ دھند لگے اندھیرے کی آنکھ میں جالنے کے لئے بڑھ رہے تھے۔ حسن پور کی آبادی اس قدر دور تھی کہ وہاں پہنچتے پہنچتے رات بھی ہو سکتی تھی۔ میرے لئے وقت بہت قیمتی اور اہم تھا۔

میں نے اپنا سفری تھیلہ کھول کر اس کا سرسری سا جائزہ لیا اس میں تمام چیزیں جوں کی توں موجود تھیں کسی بھی چیز کو پھینچا نہیں گیا تھا۔ یکایک مجھے اپنے ریلوے کا خیال آیا اور یہ خوف بھی دامن گیر ہوا کہ کہیں اسے میرے دشمن کے آدمیوں نے غیر محسوس انداز سے نکال نہ لیا ہو؟ یہ خیال آتے ہی میرے خون میں غلام پیدا ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کپڑوں کی حمیں کھولنا شروع کیں اور ایک کی ہر چیز الٹ پلٹ کر کرک دی جس طرح کسٹم والے الٹ پلٹ دیتے ہیں۔ ریلوے کا پکٹ اپنی جگہ دیکھ کر مجھے اطمینان سا ہوا۔

میں نے تھیلہ اپنے کندھے سے لٹکایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاؤں کی سمت چل پڑا۔ تقریباً ایک میل کی مسافت میں نے ندی کے کنارے ساتھ ساتھ چل کر طے کی پھر اپنا رخ اس وسیع و عریض میدان کی طرف موڑ لیا جو جھاڑیوں کے پاس جا کر ختم ہوتا تھا۔ ان جھاڑیوں کی دوسری جانب ایک بچی سڑک تھی جو بل کھاتی ہوئی گاؤں کی طرف چلی گئی تھی۔ اس راستے پر دائیں جانب وہ پراسرار سی حویلی تھی جس کا فاصلہ سڑک سے کوئی دو تین فرلانگ رہا ہو گا۔

سڑک پر پہنچ کر میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی تھی۔ فی الوقت حویلی کے پاس سے

اس روز وہ نصف رات تک مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی اور اس کا دل اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا اور نہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسے جانے دوں۔ اب لگ رہا تھا کہ آج کی رات ہماری زندگی کی آخری رات ہے۔

☆-----☆

اگلے روز میری آنکھ کھلی تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ یہ حقیقت تھی کہ میں اپنے بستر کی بجائے کھلے آسمان کے نیچے بٹھلیں گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ قریب ہی ندی کا کنارہ تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور پھر اپنے گرد کا جائزہ لینے لگا۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر میرا سفری بیگ رکھا ہوا تھا۔ دور دور تک پھوٹی بڑی جھاڑیاں اور لمبی لمبی گھاس نظر آرہی تھی۔ پورا علاقہ شائے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ یہ گوشہ حسن پور کا تھا۔ دور بہت دور حسن پور کی آبادی دکھائی دے رہی تھی۔ مغربی سمت میں ملراجہ بھرت چندر کی حویلی کا مقعبی حصہ بھی بہت صاف اور واضح طور پر نظر آرہا تھا۔

میں حیران و ششدر رہا کہ مجھے کس لئے یہاں لا کر ڈال دیا گیا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ گورکھ دھندا نہیں ہے؟ میں نے جو کچھ دیکھا کیا وہ خواب تھا؟ کیا خواب اتنے حسین بھی ہوتے ہیں؟ مجھے تو زور دیکر یہ احساس ہوتا رہا کہ میں خواب ہی دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے اپنا ششدر دور کرنے کی غرض سے اپنی قبض کی آستین الٹ کر دیکھی۔ زخم مندمل ہو گئے تھے لیکن زخموں کے نشان ابھی باقی تھے۔ سر پر چوٹ کی جگہ دبائے سے ہلکا ہلکا دور بھی محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے ان تمام واقعات کے بارے میں سوچا جو یکے بعد دیگرے بڑی تیزی سے میری زندگی میں رونما ہوئے تھے اور پھر یہاں آنے پر پروین کا بد معاشرے کے ہاتھوں سے مجھے بچانا، میری حقداری کرنا، پھر مجھے کشمی بابوٹ میں حسن پور پہنچانے کی بجائے بے ہوشی کے عالم میں یہاں چھوڑ کر چلے جانے۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ آخر

میرا گزرتا کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھا۔ مجھے اپنے گاؤں پہنچ کر سب سے پہلے کسی ایسے دوست کو تلاش کرنا تھا جس کے ہاں میرے قیام کا بندوبست ہو سکے۔ مجھے امید تھی کہ میرا کوئی دوست مجھے اتنا لبا بعا ضرور گزر جانے کے بعد بھی بھولا نہیں ہو گا۔ میں نے بچپن کے حوالے سے اپنے دوستوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور تب میرے ذہن کے انہل خانوں سے ایک شبیہ نکل کر میری نظروں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ایک غنچیدہ اور معصوم سی صورت، میرا سب سے عزیز دوست، بے ساختہ میرے لبوں پر اس کا نام آگیا، ابو بکر۔

وہ میرے بچپن کا دوست تھا میں ابو بکر کے ساتھ گزرا رہے ہوئے خوشگوار لمحات کی یادوں میں ڈوب گیا۔ میری رفتار اس کے بارے میں سوچنے کی وجہ سے آپ ہی آپ دھیمی ہوتی چلی گئی تھی۔ گاؤں بھی اب ایک دو فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں زیر لب مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اچانک کسی کتے کی غراہٹ سن کر ایک دم سے اچھل پڑا۔ میری فٹس فٹس میں دھشت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ غراہٹ کسی عام قسم کے کتے کی نہیں تھی۔ یہ آواز سامنے والی جمائویوں سے آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بس اب وہ جمائویوں سے نکل کر مجھ پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ میرے بدن پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ تاہم میں نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پایا اور سفری تھملا زمین پر رکھ کر کاجنٹی ہوئی اگھیوں سے اس کے بندھ کوٹنے لگا۔ میری متحوش نظریں بار بار سامنے والی جمائویوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اگر اس لمحے کتا جمائویوں سے نکل کر مجھ ٹوٹ پڑتا تو میں اپنا پچاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے خوف و ہراس کے عالم میں تھیلے کی ساری چیزیں الٹ پلٹ دیں تاکہ جلد سے جلد ریو الور کا پیکٹ نکال سکوں۔ بلاخر میں نے ریو الور والور پیکٹ باہر نکال لیا۔

ریو الور ہاتھ میں آئے ہی میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ میں نے چند لمحہ تک کتے کے باہر نکلنے کا انتظار کیا۔ جمائویوں کی سرسراہٹ برابر جاری تھی، کتے کی غراہٹ بھی آس پاس ہی گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ غراہٹ بند،

تمنی۔ میں مزید چوکنہ ہو گیا۔ کیونکہ اس گہری خاموشی نے خطرے کے احساس کو اور بڑھا دیا تھا۔ جب کئی لمحات گزر جانے پر بھی سناٹا طاری رہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ پھر میں نے تیزی سے ادھر ادھر بکھرا ہوا سامان سمیٹا اور اسے جلدی جلدی تھیلے میں ٹھونسنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے تھملا کندھے پر لٹکایا اور تیزی سے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ ریو الور بدستور میرے ہاتھ کی گرفت میں تھا اور میری انگلی لمبی پر تھی، میں احتیاط کے طور پر بار بار پیچھے پلٹ کر بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ میری ساری توجہ اور نگاہ اطراف کی جمائویوں پر تھی۔ مگر پھر بھی کوئی آواز مجھے سنائی نہیں دی۔ غالباً کتا کسی اور سمت نکل گیا تھا۔

ایکایک مجھے اس سفاک عورت کا خیال آیا جس نے گاؤں والوں کی زندگی کو جہنم بنا رکھا تھا۔ یہ کتا بھی اس نے پال رکھا ہو گا۔ میں کتوں کی تقریباً تمام نسلوں سے واقف تھا۔ میرے خیال میں وہ کوئی پالتو کتا تھا۔ اگر وہ شکاری کتا ہو تا تو یقیناً مجھے کسی صورت میں نہیں بخشا شاید وہ کسی بلی یا کتے کو کچھ کر غرایا ہو۔ یا یہ بھی امکان ہو کہ وہ شکاری کتا ہو اور اس کی زنجیر کسی شخص کے ہاتھ میں ہو۔ میں نے قیاس کیا کہ اس کتے کی مدد سے غالبہ نے گاؤں والوں میں خوف و ہراس اور دھشت پھیلارکھی ہو گی۔ گاؤں کے لوگ شاید اسی کتے کی موجودگی سے خائف رہتے ہوں گے۔

جس وقت میں گاؤں میں داخل ہوا تو رات کی سیاسی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ گاؤں کا بازار سنسان اور ویران دکھائی دیا۔ ان اشارہ برسوں میں مجھے ایسی کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی جس سے اندازہ ہوتا کہ اس گاؤں نے کچھ ترقی کی ہے البتہ چند دکانوں اور مکانوں کا اضافہ ضرور محسوس ہوا تھا۔ عبدالکریم کا چھوٹا سا ہوٹل جو برگہ کے بیڑ کے نیچے تھا وہ بھی بند دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ وہ ہوٹل رات کے نو بجے تک ہر موسم میں کھلا رہتا تھا۔ اس کی چائے اور مٹھائی بہت اچھی ہوتی تھی اور ہم لوگ وہاں دیر تک ڈیرہ بجائے رہتے تھے۔ مجھے دروازے کے نیچے سے روشنی ٹھنھرتی ہوئی دکھائی

چرے کا بغور جائزہ لیا اور پھر اس کی آنکھوں میں استغلاب پھیل گیا وہ توخم زدہ سے انداز میں مجھے نکلکارہ گیلا۔

کسی بھی شخص کی زندگی میں اٹھارہ برس کا عرصہ کم نہیں ہوتا ابوبکر اور میں ایک جگہ بیت جانے کے بعد ایک دوسرے کے سامنے مہوت سے کھڑے تھے وقت کی نبض جیسے رک گئی تھی۔ اگر میں نے اس کی آواز سنی نہ ہوتی تو غالباً اسے پہچان بھی نہ پاتا وہ ان برسوں میں بہت بدل گیا تھا پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے چرے پر کیوں کا جال پھیلا ہوا تھا بالوں میں چاندی جھلوانے لگی تھی اور اس کا جسم کمزوری کے باعث خفیدہ سا ہو گیا تھا۔ ابوبکر مجھے پہچان چکا تھا کیونکہ میں ذرا بھی نہیں بدلتا تھا صرف میرے بالوں میں کچھ سفیدی آگئی تھی۔ اسے مجھے اچانک اور غیر متوقع دیکھ کر اپنی بصارت پر جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے وہ اپنی جگہ بیٹھنے کے عالم میں کھڑا رہ گیا تھا۔

”ابو!“ میرے ہونٹوں پر سرگوشی کی طرح ایک لفظ مچلا اور منٹوں میں بازگشت کی طرح گونجنے لگا۔

دوسرے لمحے ابوبکر نے لائین زمین پر رکھ دی پھر اس کے جوش سے لرزے ہوئے ہاتھ فغاض بلند ہوئے۔ اس نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے وہ مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتا چاہتا تھا میں نے بھی اپنا تھیلہ پیچے رکھ دیا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑی محبت اور گرم جوش سے بھنگی ہو گئے۔ ابوبکر نے مجھے اس طرح سمجھنا چاہا جیسے وہ مجھے اپنے وجود میں سلیپا چاہتا ہو۔ پھر وہ میرے کانڈھے پر سر رکھ کر بچوں کے مانند سسکے گا میں ایک طویل عرصے کے بعد اس کی محبت کا یہ انداز دیکھ کر جذباتی ہو گیا اور میری آنکھیں جھجک گئیں مجھے اس خلوص، چاہت اور پذیرائی کی توقع نہیں تھی میں سسکے کی حالت میں اسے اور وہ مجھے دیکھنے لگا۔

اندر سے اس کی بیوی، نو جوان بیٹی اور کسمن سن بچے بھی نکل آئے۔ اس کی بیٹی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی اس نے سراپتہ سگی سے پوچھا۔

دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جاگ رہا تھا۔ راستے میں کوئی اکاؤنڈ آدی بھی نظر نہیں آیا۔ میں پہلے کبھی ایسی ویرانی نہیں دکھائی دی تھی۔ شاید شکاری کتے کے خوف کی وجہ سے اپنے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ میں ابوبکر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر رہتے ہوئے آنکھیں روشنیوں کی عادی ہو چکی تھیں اس لئے گھپ اندھیرے میں خاصا دشوار لگ رہا تھا لیکن جلد ہی میری نظریں اندھیرے میں ہر چیز کو دیکھنے اور پرکھنے عادی ہو چکی تھیں۔

میں نے ابوبکر کا گھر آسانی سے شناخت کر لیا۔ وہ بڑے ملاپ کے کنارے بنا ہو تھا۔ سپاری ٹاریل اور کھٹل کے درختوں سے گھرا ہوا تھا اس مکان کا احاطہ وسیع و عریض تھا اور اس میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں نے دروازے پر رک اپنے کان اندر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔ میں ہر طرح سے اپنی تسلی کر لیتا تھا۔ باتوں کے شور میں مجھے ابوبکر کی آواز سنائی دی وہ اپنے کسی بچے کو کسی بات پر طرح ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔ برسوں اور صدیوں کے بعد جیسے اس کی آواز سنی تھی۔ کی آواز سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں نے ایک گونا سرت سے اپنا لرزاں ہاتھ برصا آہستہ سے دروازے پر دھک دی۔ دھک کی آواز گونجنے ہی باتوں کا شور یک لمحہ تبدیل ہو گیا۔ جیسے انہوں نے کسی شیر کی دھاڑ سن لی ہو۔ ان سب کو شاید حیرت ہوئی گی کہ اس وقت کون ان کے دروازے پر آیا ہو گا؟ چند منٹوں کے بعد کسی کی آہستہ ابھری اور بند دروازے کے پاس آکر ختم ہوئی۔

”کون ہے بھئی؟“

ابوبکر کی مانوس اور محض ابھری آواز ابھری۔ جس میں کسی حد تک حیرت کا

بھی موجود تھا۔ چند منٹوں کی خاموشی کے بعد دروازہ کھل گیا۔

ابوبکر کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لائین تھی جس کی لو اس نے اونچی کر رکھی تھی اس نے لائین کو اوپر اٹھایا تو اس کی روشنی میرے چرے پر پڑنے لگی۔ اس نے میرے

لیکن آج تک ایسا حادثہ نہیں ہوا کہ کسی انسانی جان کو خطرہ لاحق ہوا ہو۔ پھر بھی لوگ ان کتوں سے خوفزدہ رہتے ہیں اور دن ڈبچتے ہی گھروں سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔“

ابو بکر نے میرے سوالوں کے جواب میں مزید بتایا۔ ”اس عورت کی عمر تیس یا تیس سال کے لگ بھگ ہو گی لیکن اس کا حسن و جمال نوخیز لڑکیوں کو شرماتا ہے۔ وہ عورت کسی حد تک سخت مزاج بھی ہے لیکن فطرتاً بہت اچھی ہے۔ اس نے گاؤں والوں پر بھی ظلم و ستم نہیں ڈھایا ہے البتہ ان چند لوگوں سے کسی نہ کسی طرح ان کی زمینیں خرید لیں جو اپنے وقت میں چوہدری بنے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں کوڑی کوڑی کا فلاح کر کے رکھ دیا جیسے اس نے ان سے کوئی انتقام لیا ہو۔ اس عورت کی شخصیت بڑی پراسرار ہے اس کی زندگی پر پردہ ہوا ہے اس کے بارے میں بہت سی چہ بیگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس نے اپنے شوہر سے طلاق لی ہے کسی کا خیال ہے کہ وہ بیوہ ہے ایک بات اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس کا شوہر لندن میں رہتا ہے جتنے سنا جاتا ہے۔ اصل حقیقت کا کسی کو کچھ علم نہیں ہے۔“

”مگر ڈھاکہ میں اس عورت کے ظلم و ستم کی کہانیاں مشہور ہیں۔“ میں آہستہ سے بولا۔ ”سنا ہے کہ اس نے گاؤں والوں کی زندگی اچھین تار بھی ہے۔ وہ اپنی دولت اور اثر و سوغ کا غلط فائدہ اٹھا رہی ہے۔“

”یہ اس کی ذات پر سراسر بہتان ہے۔“ ابو بکر نے سختی سے تردید کی۔ ”وہ اس گاؤں کے لوگوں پر ظلم و ستم ڈھاکرانے سے کیا حاصل کر سکتی ہے۔ یہاں کے لوگ غریب اور پریشان حال ہیں جس کسی نے تم سے اس عورت کے بارے میں کہا ہے وہ محض انحراف ہے۔“

میں پکارا کرہ گیا گیا اور بس الجھنے میں میرے ساتھ غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اس نے مجھے ایک ایسی عورت کو قتل کرنے کی ذمہ داری سوچی تھی جو بالکل بے گناہ تھی۔ صحیح صورت حال واضح ہونے کے بعد میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

”کیا ہوا بابا!“ پھر اس نے جذباتی منہ دیکھا تو اپنی جگہ ٹھٹک گئی۔ رات کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد گھر میں بائیں کرتے رہے۔ پھر بسا دیر کے بعد ہم دونوں مکان کے باہر بنے ہوئے چہوڑے پر آ بیٹھے اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ چاند کی ذہلی تاریکی تھی۔ آسمان پر نصف چاند منور قفاس کی پھیلی کینہ ہر شاہنا جاں بین رہی تھی۔ دھندلی چاندنی میں ٹاریل اور سپاری کے درختوں کا لکھا بہت ہی دل فریب نظر آ رہا تھا۔

میں نے ابو بکر پر یہاں آنے کا مقصد کھل کر ظاہر نہیں کیا۔ البتہ اسے وہ واقعات سنا دیے جو مجھ پر گزرے تھے ان واقعات میں ان بد معاشوں کا تذکرہ بھی جنہوں نے لاچ میں میری درگت بھائی تھی پھر اس لڑکی کا بھی ذکر آیا جس نے تلوار داری کی تھی جو میری بیٹی بنی رہی اور پورے جذب اور لگن سے میری خدمت کی پھر میرے صحت یاب ہونے کے بعد مجھ دیرانے میں چھوڑ گئی۔

ابو بکر نے میری کہانی پوری توجہ سے سنی تھی۔ اسے بد معاشوں والے واقعے پر قدر حیرت ہوئی۔ ”پوچھو کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ وہ آس پاس کے گاؤں اور کاروبار کے سلسلے میں بلا ٹانہ آتا جا رہا تھا۔ اسے آج تک اس طے کی کوئی لڑکی دکھائی نہیں دی۔“

میرے استفسار پر ابو بکر نے عالیہ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ ”چند برسوں پہلے ہی بات ہے یہ جو بیٹی اس عورت نے مہاراجہ کے بیٹے سے خرید لی تھی۔ اس جو بیٹی کو انہی نے ایک عالی شان محل کی طرح آراستہ دیا تھا۔ وہ سال میں دو تین مہینے کے لئے اس گاؤں میں آتی ہے اور کسی ملک کی رانی کی طرح بڑی شان و شوکت سے رہتی ہے اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ اسے خود نہیں معلوم کہ کتابینک بیلنس ہے۔ نوکر کی فوج اس کی خدمت اور حفاظت کے لئے مستعد رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بے شمار کتے بھی پال رکھے ہیں وہ رات کے وقت اپنے پالتو کتوں کو کھلا چھوڑ دیتی

میرے لئے ادریس الحق کی شخصیت بھی کم پراسرار نہ تھی۔ وہ عالیہ کا شوہر بھی
 مسکاتھا۔ اس بات کا امکان اس لئے اور بڑھ جاتا تھا کہ عالیہ بے پناہ دولت کی مالک
 تھی۔ وہ عالیہ کو اپنے راستے کا غنا سمجھ کر نکال پھینکنا چاہتا تھا کہ اس کی دولت پر قابض ہو
 سکے اس کے علاوہ بھی عالیہ کا اس سے کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا تھا جو فی الحال میری
 نگاہوں سے اوجھل تھا۔

میں دل میں ادریس الحق کی ذہانت اور منصوبے کی داد دیتے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے
 لئے عالیہ کو اپنے راستے سے ہٹانا ناممکن ہو گیا تو اس نے میرا انتخاب کیا اور اس مقصد کے
 لئے ایک بھاری رقم مقرر کی۔ حقیقتاً اس دور میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں۔ تاہم ہر
 شخص کی جان بھی اڑاں نہیں ہے کہ ازم عالیہ کی جان تو اڑاں نہیں تھی۔ شاید ادریس
 الحق کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ عالیہ کو قتل کرنا کسی پیشہ ور قاتل کے بس کی بات نہیں
 ہے بلکہ کوئی جری سپاہی ہی یہ فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ تاہم ادریس الحق یہ بات بھول
 گیا کہ ایک جری سپاہی اور پیشہ ور قاتل میں فرق ہے۔ سپاہی میدان جنگ میں اپنی
 عمری کے لئے لڑتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی غرض نہیں ہوتی ہے اور نہ وہ موت کی پرواہ
 کرتا ہے لیکن وہ کسی کو بے گناہ قتل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچا کہ عالیہ کو قتل کرنا کسی طرح بھی
 مناسب نہیں بلکہ مجھے واپس ادریس الحق کے پاس پہنچ کر کسی ترکیب سے بلیک میل
 کرنے کا مواد اس سے حاصل کر لینا چاہئے۔

دوسرے دن میں نے ابو بکر سے گاؤں والوں اور دوستوں کے بارے میں دریافت
 کیا۔ چند ماہ کے بارے میں بھی پوچھا جو اپنی بیٹی بانو کے ساتھ گاؤں میں رہتی تھی۔
 انہوں نے بتایا کہ چند ماہ سترہ اٹھارہ سال پہلے بنی کے دکھ سے مر گئی۔ بانو اپنے گناہ کا بوجھ
 لے کر جانے کمال چلی گئی پھر اس روز کے بعد سے اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کے
 رہنے میں ایک عام خیال یہ تھا کہ شاید اس نے خودکشی کر لی۔ میں نے گاؤں والوں اور

کہ کیا کروں میں ایک الجھن سے دوچار ہو گیا تھا اور عجیب غمخے میں پڑ گیا تھا۔
 ابو بکر نے مجھے سوچ میں مبتلا دیکھ کر کہا۔ ”گاؤں والوں کے لئے ایک بات
 خاصی حیرت کا باعث ہے کہ یہ عورت نہ صرف گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بہت
 طرح سے جاتی ہے بلکہ گاؤں کے ایک ایک فرد کے بارے میں اس کی معلومات
 خیر ہیں۔ اسے ذرا ذرا سی باتوں کی خبر رہتی ہے جیسے اس نے جاسوس کا جال بچایا
 ہو۔ وہ گاؤں کے ایک ایک فرد کا نام اور اس کے خاندانی پس منظر سے بھی بہ خوبی واقف
 ہے۔ خدا جانے یہ ساری معلومات اس نے کہاں سے حاصل کی ہیں۔“

میری سوچ میں حلاطم پیدا ہونے لگا۔ مجھے ابو بکر کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ
 عورت کو قتل کرنا اس قدر آسان نہیں ہے جیسا کہ میں نے تصور کر لیا تھا۔ وہ اس
 میں کسی حکمران کی طرح شان و شوکت اور جاہ و جلال سے رہتی تھی۔ اس نے
 حفاظت کے لئے خود غور کئے پال رکھے تھے کتوں کے علاوہ بہت سے مسلح محافظ بھی
 تھے وہ جب بھی حویلی سے باہر نکلتی اس کے ہمراہ کتوں اور محافظوں کا لشکر ہوتا تھا۔
 کے لوگوں پر اس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تک رسائی کسی
 ممکن نہ تھی۔

میرا ذہن ایک عجیب سی کشش میں مبتلا ہو گیا اس غور کو قتل کرنے میں
 جان کا خطرہ تھا جبکہ اسے قتل نہ کرنے کی صورت میں بھی میرے لئے پھاسی کا پھندا
 تھا۔ میری جان دونوں طرف سے سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کو
 راہ کا انتخاب کروں۔ اگر میں ایک بے گناہ کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب
 بھی جاتا تو میرا ضمیر زندگی بھر مجھے چین لینے نہیں دیتا لیکن آئے ختم کرنے سے
 وامن سے وہ داغ ضرور دھل جاتے جو مجھے جیل کی کال کو شری اور پھانسی کے پھن
 تک لے جاسکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بھاری رقم بھی میرے ہاتھ آجاتی۔ جس
 ذریعے میں میں نے سرنے سے اپنی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

دے جاتی مگر پھر وہی سکوت چھا جاتا۔ کان میں دیر تک اندھیرے میں کھڑا اندر کی سن گن لیتا رہا تھا۔ میرے کان حویلی کے صدر دروازے پر لگے ہوئے تھے مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ مسلح محافظ اس وقت کہاں ہوں گے؟ خاصا وقت گزرنے پر بھی کوئی آواز سنائی نہیں دی تو میں سمجھ گیا کہ اس وقت سب گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں انہیں کس بات کا خطرہ ہو سکتا تھا۔

میں نے پھل مارچ کی روشنی میں اس مقام کا اندازہ لگایا جہاں گھنی بھاریاں ایک زمین دوڑ راستے کو چھپائے ہوئے تھیں۔ اٹھارہ سال پہلے میں اس چور راستے سے حویلی میں داخل ہوا کرتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں عالیہ نے وہ گزر گاہ بند نہ کرادی ہو لیکن میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر تلاش کے بعد مجھے مجاز بھنگار میں چھپا ہوا راستہ نظر آ گیا۔

میں نے اس راستے کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے پلٹ کر محتاط انداز میں ارد گرد کا جائزہ لیا پھر میں اس راستے سے حویلی میں داخل ہو گیا۔ میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا اور مجھے واضح طور پر اس کے دھڑکنے کی صدا سنائی دے رہی تھی۔

حویلی کا ماحول ایک پراسرار اور بوجھل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ راہداریاں ویران پڑی تھیں۔ کسی کسی راہداری میں ٹھہری ہوئی روشنی نظر آئیں۔ میں ایک تاریک راہداری سے گزرتا ہوا اس زینے کی جانب بڑھا جو اوپر ایک خواب گاہ تک پہنچتا تھا۔ وہ خواب گاہ ہلالی منزل کے مغربی حصے میں واقع تھی اور حویلی کی دیگر خواب گاہوں سے نسبتاً کشادہ ہو ادار اور عالیشان تھی۔ میرا خیال تھا کہ عالیہ نے اپنے لئے اسی خواب گاہ کا انتخاب کیا ہو گا؟ میرا یہاں آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ عالیہ کون سی خواب گاہ استعمال کرتی ہے۔

چہرہ کہ میں اسے قتل کرنے کا خیال دل سے نکال چکا تھا تاہم میں اپنے فیصلے پر بہت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا تھا۔ میرے دل و دماغ میں برابر ایک کشمکش سی جاری

دوستوں کے بارے میں سن کر سکون و اطمینان کا سانس لیا۔ میرے دوست زندہ تھے بوڑھے لوگوں کی قبریں آباد تھیں میں شام تک اپنے دوستوں سے ملتا رہا اور جو بزرگ زندہ رہ گئے تھے ان کی خدمت میں حاضری دی۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے بھرا ہوا ریو اور جیب میں رکھا اور ابو بکر کو اس میں لے کر اسے ساری کہانی سنائی۔ وہ ہنچکا سا ہو کر رہ گیا۔ جب میں نے حویلی جانے خیال ظاہر کیا تو وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ اس نے مجھے بہت سمجھایا کہ رات گئے میرا حویلی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہاں کئے آزادانہ گھومتے رہتے ہیں۔ ان سے کر حویلی میں داخل ہونا بہت مشکل ہے۔ ابو بکر کو علم نہیں تھا کہ میں اس حویلی کے چپے سے واقف تھا۔ میں نے کئی راتیں اس حویلی میں بسر کی تھیں جبکہ اس وقت دن بھی کوئی شخص ادھر پہنچتا بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے بے خوف ہو کر ادھر جانے ارادہ کیا تھا۔

ابو بکر میرے جاں نثار دوستوں میں سے تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں نے حو جانے کا مقصد ارادہ کر لیا ہے اور مجھے باز نہیں رکھا جاسکتا ہے اور میں خطروں میں لینے لے لیتا رہوں تو اس نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا لیکن میں اسے سمجھا بھگا کر اکیلا ہی حویلی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً ایک پھل مارچ ساتھ لے لی تھی جو جدید ترین اور اس کی روشنی بڑی بڑی ٹارچوں کی طرح تیز تھی اور بہت دور تک جاتی تھی۔ طرف اس قدر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا کہ پچھتی پچھتی میرے ہاتھ کی گرفت فوراً ریو اور پر مضبوط ہو جاتی اور میں چونکا ہوا کر قدم اٹھانے لگتا۔ مجھے سب سے زیادہ کٹوز دھڑکا لگا ہوا تھا اس کے باوجود میں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ میں پھونک پھونک کر رکھتا جا رہا تھا اور حویلی مجھے میلوں کی مسافت پر لگ رہی تھی۔ تاہم میں بخیر و عافیت کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

حویلی پر گہری تاریکی اور سکوت کا راج تھا۔ گاہ بہ گاہ کسی کتے کی آواز ضرور

معاقبت سے بھی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر
پچھے دیکھا راہداری کے آخری سرے پر دو تین آدمیوں کے دوڑتے ہوئے سامنے نظر آ
رہے تھے میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ بھاگتے بھاگتے میری ٹانگیں جیسے شل ہو گئی
تھیں۔ اندر قدموں کا شراب بالکل ختم ہو چکا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا اور
اس پر عمل کرنے کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔ فی الحال بچاؤ کی یہی ایک صورت تھی۔
میرا اس سے قتل کی بھاگتے ہوئے افراد راہداری میں داخل ہوتے ہیں نہایت پہری سے
ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی میرے منتقوں سے ایک ناگواری ہو نکرائی۔ میں نے جیب
سے خنجر نکال لیا اور اس کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ دوسرے ہی پل میری
پیر سے ہاتھ سے گرتے گرتے پٹی۔ کمرے میں ایک کراڑیل کتا موجود تھا۔ میری رنگوں
میں لو ٹھہر گیا۔ غالباً کتا بھی میری آہٹ اور بو سونگھ کر چونکا ہوا تھا۔ ہم دونوں کی
ٹانگیں ملیں۔ وہ زنجیر سے بندھا ہوا نہ ہو تا تو مجھ پر چلا آگ لگا چکا ہوتا میں نے فوری
آبی لڑی بجائی اور بو کھلا ہٹ کے عالم میں کمرے سے نکل آیا۔ دراصل میں فائرنگ کر کے
اپنی موت اور معیشت کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس خیال سے میں کچھ خوف زدہ
ماورہ تھا۔ راہداری میں دو مسلح محافظ تیز تیز قدموں سے ایک سمت چلتے ہوئے دکھائی
دیے۔ خوش قسمتی سے ان کی پشت میری جانب تھی۔ جب وہ زینوں کی طرف مڑے
وہ چلے ہوئے تو میری جان میں جان آئی اور میں تقریباً بھاگتے کے انداز سے عقبی
دروازے کی طرف چل پڑا۔

حویلی سے باہر آ کر میں نے چور راستے کو پھلے کی طرح جھانپوں سے ڈھک دیا۔
میری تھاکہ کسی کو حویلی میں میرے داخل ہونے کا احساس نہ ہو سکے۔ فرلانگ ہماری
مسافت طے کرنے کے بعد جب میں میدان کے وسط میں پہنچا تو ہوا کے خوشگوار
ہموں نے میرے اندر فرحت و تازگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ میں نے انتہائی سکون اور

تھی اور میرے لئے کسی حتی فیصلے پر پہنچنا دشوار ہو گیا تھا۔ میری جان ایک بلیک میلر کے
ہاتھوں میں تھی اور اس سے چھٹکارا پانے کا واحد راستہ یہ تھا کہ میں عالیہ کو موت کے
گھاٹ اتار دوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ایک بار حویلی کا اچھی طرح جائزہ لے لوں اور پھر
عالیہ کی خواہش بھی معلوم کر لوں تاکہ جب بھی اسے قتل کرنا ناگزیر ہو جائے تو عملی قدم
اٹھانے میں زیادہ دشواری اور دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میں نے ہالائی منزل کے زینے پر قدم رکھائی تھا کہ کسی کتے کی غراہٹ سنائی دی۔
میں اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ دہشت کی ایک سرد لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ بدحواسی کے
باعث مجھ میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ پیچھے مڑ کر موت کے فرشتے کو دیکھ لوں۔ چند
ثانیوں کے بعد کئی کتوں نے ایک ساتھ غراٹ شروع کیا تو میں مزید دہشت زدہ ہو گیا پھر
اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ کتے میری پشت پر نہیں بلکہ کسی کمرے میں بند ہیں اور
میری بو سونگھ کر یا کھڑکی میں سے جھانک کر مجھے دیکھ کر غرا رہے ہیں اگر وہ آزاد ہوتے
اب تک میرا اتنا پانچہ ہو چکا ہوتا۔

میں نے ریو اور پرانی گرفت مضبوط کی اور پلٹ کر اس سمت دیکھا جہاں سے کتوں
کے غراہٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک جنگلے دار کھڑکی نظر
آئی۔ جنگلے کے عقب سے چار انتہائی خوشنور کتے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے مجھے
گھور رہے تھے۔ ان کی لمبی اور خردک زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے پہلی نظر میں
اندازہ لگا لیا کہ وہ چاروں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک ایک انہوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ ان کے بھونکنے کے شور سے پوری حویلی
گونج اٹھی چند لمبے بعد کسی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور پھر جیسے حویلی میں
بھونچال سا آگیا۔ میں سرا سید سا ہو کر مخالف سمت میں دوڑ پڑا۔ بدحواسی کے باوجود میں
اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ دائیں بائیں دو تین موڑ مڑنے کے بعد میں ایک ایسا
راہداری میں پہنچ گیا جہاں آٹنے سامنے کی کمرے بنے ہوئے تھے۔

سرشاری سے گرمی سانس لیں اور کچھ دیر سستانے کی غرض سے ایک بڑے چتر پر بیٹھ گئیں۔ مگر موت کے منہ سے ہال ہال فک کر آیا تھا۔ وہ نہ گاؤں والوں کو ہڈیوں کا بھی نام و نشان نہ ملکہ دیکھا جائے تو مجھے ایک طرح سے نیا جنم ملا تھا۔ ذرا چوک ہو جاتی تو میرا جسم عبرتناک انجم کو پہنچ جاتا۔

ابو بکر میرے انتقال میں بڑی بے چینی، وحشت اور اضطراب سے مثل رہا تھا۔ دیکھتے ہی اس کی آنکھیں سرت سے چمک اٹھیں تھیں۔ وہ پلٹا ہوا قریب آیا اور والہانہ انداز میں مجھ سے چٹ گئیں۔ جب اسے حویلی میں پیش آنے والا ستلا تو اس کے چہرے پر کئی رنگ آنکر گزر گئے اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ کمائی کا ایک ایک لفظ اس کے لئے سستی خیر ہے۔

اگلے روز صبح ہی صبح ابوبکر نے مجھے پری طرح بھنجوڑ ڈالا۔ کم خوابی کے میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ جب میں نے ابوبکر کا متوحش چہرہ اور اس کی پٹی آنکھیں دیکھیں تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میری نیند ہرن ہو گئی۔ میں ہڑا کے اٹھ جائے کیا ہو گیا تھا؟

میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے ابوبکر؟ خیریت تو ہے؟ یہ تم۔۔۔۔۔۔“ مجھ کو دیر پہلے حویلی سے ایک ملازم آیا تھا۔ ”ابوبکر نے خوفزدہ لیجے میں اس نے تمہارے نام یہ پیغام دیا ہے کہ پہلی فرصت میں حویلی پہنچو۔ عالیہ بیگم تم ملاقات کرنا چاہتی ہے۔“

عالیہ کا بھیجا ہوا پیغام سن کر میں اچھل پڑا یکے بعد دیگرے کئی خدشات میرا ذہن میں ابھرے۔ یہ امر کسی طرح بھی کم تشویش ناک نہ تھا کہ عالیہ نے بذات خود اپنے ہاں طلب کیا ہے۔ آخر مجھ جیسے معمولی آدمی کی اس کے نزدیک کیا حیثیت ہو تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید رات کو مجھے کسی نے حویلی کے پاس منڈلا لائے ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میرا صحیح سلامت واپس آنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اصل

کچھ اور ہی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ نہ جاؤں۔ میں اس کا کوئی تو کریا تابع تو نہیں تھا۔ چونکہ میرا اسے دیکھنا اور اس سے ملنا بے حد ضروری تھا اس لئے میں نے حویلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر میں یہ بھی تو جاننا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے کس لئے بلایا ہے۔

ابوبکر وحشت زدگی کے عالم میں اور غالباً میرے کچھ بولنے کے انتظار میں خاموش کھڑا تھا۔ میں نے نظارہ اسے تسلی دی مگر اندر ہی اندر میری تشویش بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ایک ماحولم خطرے کا احساس میرے لوم میں گردش کرنے لگا تھا۔ عالیہ کے ہاں میری طلبی کیا معنی رکھتی تھی؟ کہیں اسے میرے مشن کا علم تو نہیں ہو گیا ہے؟ یہ سوال کسی زہریلے ناگ کی طرح مجھے بالدر ہونے لگا۔

کافی دیر کے بعد میرا خوف قدرے کم ہوا۔ اس وقت تک میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت جا کر عالیہ سے مل لینا چاہئے اس طرح کم سے کم میری الجھنیں تو دور ہو سکتی تھیں۔ میرے لئے عالیہ کی ذات ویسے بھی کسی معنی سے کم نہ تھی۔ وہ مجھے قتل کرنے سے توری۔ میں تو ایک انتہائی خفیہ مشن پر آیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس ملاقات کے بعد مجھے آئندہ کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنے میں بڑی مدد مل سکتی تھی۔ ملاقات سے پہلے طرح طرح کے خدشات کو جنم دینا فضول تھا۔

☆-----☆-----☆

حویلی کی طرف جاتے ہوئے میرے سینے میں دل کے دھڑکنے کی رفتار تھوڑی بہ تھوڑی ہوتی جا رہی تھی۔ سورج کی تیزی اور پچھلی روشنی میں، میں نے حویلی کی پُر شکوہ عمارت دیکھی۔ آج اس کا طلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ رنگ و روغن نے اس کا حسن دوہلا کر دیا تھا اور دروازے پر دروازہ کے دو مسخ توجوان کھڑے پرسودے رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر وہ تین کتے زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے جن سے رات میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بھونکنے اور غرائے لگے تو ایک محافظ نے انہیں خاموش کر لیا۔ دوسرا محافظ تیز تیز قدموں سے اندر اطلاع کرنے دوڑ گیا۔ میں حویلی کے اندر دل سے جا بڑھنے لینگا۔

اور سرد مرد کھائی دے رہی تھی۔ جیسے اسے اپنے حسن و جمال پر بڑا ناز ہے۔ دولت اور اہمیت کا سمجھنا ہے اس کی نگاہوں میں سازش ہی جھلک رہی تھی۔

ہم دونوں کی نگاہیں آپس میں پیوست ہی ہو گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے دیکھ کر مجھ پر خود فراموشی کی کیفیت کتنی ٹائیوں تک طاری رہی۔ اس کی شبلی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس کی حسین اور بڑی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تیرنے لگیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے کہیں کوسی مٹی تھی۔ مگر ہم سی ہو گئی تھی۔ میں اس عمر میں بھی ایسی سحرانگیز شخصیت کا مالک تھا کہ عورتیں مجھے تک دیکھنے لگتی تھیں۔ شاید اسے میری مردانہ وجاہت نے متاثر کر دیا تھا۔ میں بھی اس کے ظلم میں جیسے کھو کر رہ گیا تھا۔ واپس کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ پھر اس کی آواز نے مجھے چوکایا تھا۔ اس نے حترم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

”خوش آمدید کمیشن منبر احمد!“ میں نے اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا محسوس کیا تھا۔

”کیا آپ نے مجھے طلب کیا تھا؟“ میں نے خوش دلی سے پوچھا۔
 ”جی ہاں۔“ اس نے اپنا خوشامبر بولایا۔ ”میں نے سوچا کہ جب آپ اٹھارہ برس کے بعد گاؤں آئے ہیں تو کیوں نہ آپ سے ملاقات کر لی جائے۔“
 ”ہمت بہت شکر ہے۔“ میں نے زہر لب مسکراتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا آپ اس خاکسار سے واقف ہیں؟“

”کیوں نہیں؟“ اس کے سرخ گداز لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ رہ گئی تھی۔ میں نے تنجب ہو کر کہا۔ ”میں سترہ اٹھارہ برسوں کے بعد پندرہ سولہ رات میل آیا ہوں۔ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی آپ کا تعلق اس گاؤں سے ماضی میں رہا ہے۔ پھر آپ میرے ہاں سے میں کیسے اور کس طرح سے جانتی ہیں؟“

”اس موضوع پر آپ سے کسی اور وقت بات ہو گی۔“ وہ تجاہلی عارفانہ سے بولی۔

میرے سینے میں عجیب سی غفلت ہو رہی تھی۔ ذہن طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ کئی سوال ابھرے اور اندیشے اپنا جواز پیش کر رہے تھے۔ میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی اور بدن پر پلینڈ پھوٹ رہا تھا۔ میدان جنگ میں بھی میری ایسی کیفیت نہیں ہوئی تھی۔

محافظ چند لمحوں میں اسی طرح دوڑا دوڑا دیا پس آیا تو اس کے پیچھے ایک اور دروازہ نوجوان بھی تھا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر اندر مٹی سے کی طرف بڑھا اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کسی گنگے کی طرح خاموش رہا۔ میں اس کے ساتھ فوجی انداز سے چل رہا تھا۔ میرے اندر کا شعور خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگا۔ حوصلی اب کسی عمل کی طرح آراستہ ہو چکی تھی۔ لمبی سی راہداری طے کرنے کے بعد ایک زینہ آیا جو زیریں سے کی طرف جاتا تھا۔ چند لمحوں بعد میں اور وہ نوجوان ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

اس نوجوان نے بڑے مؤدبانہ انداز سے دروازے پر مخصوص طریقے سے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوسرے لمحے دروازے کے ہینڈل کاٹھوپکڑ کے گھمبایا۔ دروازہ اتنا گھل گیا کہ ایک آدمی اندر جا سکے۔ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس نے اپنے سر کو خفیف سا خم دے کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

میں اس کمرے کی زیبائش بچٹی بچٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میری نگاہیں بھٹک کر ایک مربع صوفے کے پاس کھڑے ہوئے تراشیدہ جھٹے کے سرپا پر جیسے جم کر رہ گئیں۔ اس کے بدن پر نئے چرائیہ جل رہے تھے۔ ایک حسین بیکر کسی قدر شانہ شہکت سے میری نظروں کے سامنے موجود تھا۔ یہ عالیہ تھی۔ میں اس کے دلکش حسن اور شخصیت سے مرعوب ہو کر جھگ سا ہو گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر حسین ہوگی اس میں کشش اس قدر تھی کہ میرے دل پر قیامت ٹوٹ پڑی لیکن وہ کسی قدر خطرناک

”دیئے اٹھارہ برسوں کے بعد آپ کو اپنے گاؤں کی یاد کیسے آگئی؟“

”گاؤں کی مٹی کی خوشبو مجھے یہاں سمجھ لائی؟“ میں نے جواب دیا۔ ”کوئی اپنی جگہ کو کیسے بھول سکتا ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہو۔“

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں کیپٹن مہرور احمد!“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”اور جھوٹ بولنا فوجی کا شیعہ نہیں ہے۔“

”آپ کس طرح سے کہہ سکتی ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ مجھے بھلا اس کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے انجان بن کر کہا۔

”کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے یہ میں سمجھتا تھا جانتی ہوں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہو؟“ اس نے استہزائی انداز سے کہا اور اس کے چہرے پر ہنسی آگئی۔

اس نے جیسے میری کنیٹی پر تڑ سے ایک پتھر دے ملا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر میری ریزہ کی ہڈی کو چھو گئی۔

عالیہ نے مجھے نگاہ اور کہنے کی سی حالت میں پا کر سرد سفاک لہجے میں پوچھا۔ ”کیا یہ سچ نہیں ہے؟“

میں اس کے اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ اس کے علم میں سارے واقعات آپکے تھے۔ اس سے جیسے کوئی بات چھپی نہ رہ سکی تھی۔ میں زمین میں گڑنے لگا تھا۔ مجھے اپنی موت سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ میں اب اس کے جال میں پھنس چکا تھا۔ مگر میں ابھی اس کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بڑی دھڑائی سے کہا۔ ”کسی نے آپ کو میرے خلاف بھڑکایا ہے۔“

”تم اپنے ارادے سے صاف انکار کر رہے ہو لیکن یہ سچ ہے۔“ وہ کہنے لگی۔ ”میں تم مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا کر آئے ہو۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ میں نے بھی تمہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کون کا مایاب اور قاتل بننا

”آپ مجھے قتل کرنا چاہتی ہیں؟“ میں بھونچکا سا ہو گیا۔ ”وہ کس لئے؟ میں نے کیا کیا بگاڑا؟ میں نے کیا جرم کیا جس کی سزا آپ مجھے موت کی صورت میں دینا چاہتی

اس کا دلچسپ اور مخاطب کا انداز ایک دم بدل گیا۔ وہ کس قدر زہر خند سے ”میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ ایک طویل اور تھکا دینے والا انتظار“ اس انتظار میں قدر کرپ اور اذیت تھی کہ تم اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں کر سکتے۔ تم کھڑے سوچ رہے ہو۔ اپنی جیب سے ریوا اور نکالو جو تم نے مجھے قتل کرنے کے لئے خریدنا میرے سینے میں اس کی سہلی گولیاں داغ دو۔ ایسا سہرا موقع تمہیں پھر کبھی نہیں ملے گا۔“

میرے حلق میں گرہیں پڑنے لگیں۔ وہ اس قدر جذباتی ہو جائے گی کہ میں سوچ سکتا تھا۔ یہ ایک نئی پھینک میرے سامنے تھی۔ میں نے لڑکھائی ہوئی آواز میں ”میں نے قتل کا منصوبہ ترک کر دیا ہے۔“

”وہ کس لئے؟“ اس نے حیرت سے اپنی لائمی لائمی پلکیں جھپکائیں۔ ”یہ بات تم نے تو نہیں کہہ رہے ہو کہ اس وقت تم میرے رحم و کرم پر ہو اور اپنی جان بچانا چاہتے ہو؟“

”نہیں مجھے اور میں الحق نے آپ کے بارے میں جو کہانیاں سنائی تھیں اس میں برابر بھی صداقت نہیں ہے۔ مجھے یہاں آکر علم ہوا کہ حقیقت کیا ہے۔ میں موت ڈرنے والا نہیں ہوں۔ اس لئے کہ موت کا ایک دن معین ہے اور میں ایک فوجی ہوں۔“

”لیکن بد عمدی ایک سپاہی کے شیلیان شان نہیں ہوتی ہے۔“ اس نے طنز سے لہجہ کہا۔

”لیکن ایک انسان کی جان اس قدر ارزاں نہیں ہوتی ہے کہ اسے زندگی اور مریت سے پاگل کر دیا جائے۔“

”لیکن اس نے ہمیں میری جان کے عوض دولاکھ دینے کا وعدہ کیا ہے اور تم نے اسے یقین دلایا ہے کہ میری جان لے کر رہو گے۔“

”اگر وہ ایک کروڑ ڈاکا بھی دے تو میں ایک بے گناہ شخص کو قتل نہ کروں۔“ میں نے مضبوط لیے میں کہا۔ ”اس غیبت شخص نے مجھے بلیک میل کیا اور درغلایا۔ اب مجھے کسی بات کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

”کیا واقعی تمہارے نزدیک ایک آدمی اس قدر وقعت رکھتا ہے؟“ اس کے چہرے پر ابرسا اٹھ گیا۔

میں نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ ”جی ہاں۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ اس کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسنے لگیں۔ ”بزدل آدمی! کیا تم اپنے آپ کو موت کے منہ میں دیکھ کر جان بچانے کے لئے فریب سے کام نہیں لے رہے ہو؟“ اس کا چہرہ تھمتانے لگا۔

”میں آپ کو اپنی سچائی کا کس طرح سے یقین دلاؤں؟“ میں نے کسی قدر پُر سکون لہجے میں کہا۔

”کیا تم نے کبھی اپنی زندگی میں بچ بولا ہے۔“ اس نے زہر خند سے پوچھا۔

”ایک سپاہی کی زبان اور اس کا لہجہ اس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے۔“ میں نے پُر سکون لہجے میں جواب دیا۔

”تم سپاہی نہیں بلکہ ایک مرد بھی ہو۔ دنیا کا ہر شخص چاہے اس نے کسی شخصیت میں پناہ کیوں نہ لے رکھی ہو وہ پہلے مرد ہی ہوتا ہے۔ خود غرض، فربہی..... تم صرف اپنی جان بچانا چاہتے ہو۔“ وہ پھٹکاری۔

”معلوم نہیں کیوں آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔ آپ کو کس طرح

اور کیسے اپنی سچائی کا یقین دلاؤں؟ کاش! سچائی ٹاپنے کا کوئی پیمانہ اس دنیا میں ہو تا کیا آپ اتنی سی بات نہیں جانتی ہیں کہ موت سے ڈرنے والے کبھی اپنی جان بھٹیلے پر لئے نہیں نکلتے ہیں۔ میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“

”تم مجھے فوجی کم کسی کالج کے پیکچر زیادہ معلوم ہو رہے ہو۔“ وہ تسخر آمیز لہجے میں بولی۔ ”مجھے تمہاری سچائی کا اس وقت یقین آئے گا جب تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔“

”میں کل ہی کسی دقت یہ گاؤں چھوڑ دوں گا۔“ میں نے تجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پھر کبھی بھی اس گاؤں میں آنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

”بہت خوب..... میں تمہاری زبان سے یہی الفاظ سنتا چاہتی تھی۔“ اس کے سرخ گداز ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی بڑی سیاہ آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے تجھے لیے میں دریافت کیا۔ ”تم ادریس الحق کو اپنے مشن کی ناکامی کا سبب کیا بتاؤ گے؟ کیا پادشہ پش کرو گے؟ یہی تم نے سوچا ہے؟“

”اس وقت میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”میں کوئی ایسا پادشہ پیش کروں گا کہ اسے میری بات کا یقین آجائے۔ اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاشی بھی نہیں ٹوٹے گی۔“

”کیا تم ادریس الحق کو کوئی بے وقوف شخص سمجھتے ہو؟“ وہ استہزائی لہجے میں بولی۔ ”میں نہیں بلکہ وہ مجھے سمجھتا ہے۔“

”تم اسے کتنا جانتے ہو؟“

”میں اسے ذاتی طور پر بالکل بھی نہیں جانتا۔ میری اس سے جو پہلی ملاقات ہوئی وہ صرف دو گھنٹے کی تھی۔ مگر میں نے یہ بات اس کے بارے میں ضرور محسوس کی کہ وہ ایک عیلا اور مجرمانہ ذہن کا مالک ہے۔“

”میں ہمیں اس کے بارے میں بتاتی ہوں کہ وہ کیا چیز ہے۔ وہ شاطر ذہن کا مالک

”اور ایس الحق ایک منظم گروہ کا سرغنہ ہے جو زیر زمین کام کرتا ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”میدان جنگ میں لڑنا اور ہات سے اور زیر زمین بد معاشوں سے لڑنا اور ہات سے۔ گروہ میں پیشہ ور قاتل بھی شامل ہیں۔ وہ اتنے بے رحم اور سفاک ہیں کہ کسی کو گردن ان کے لئے ایسا ہی ہے جیسا میرے یا تمہارے لئے راستے کے پتھر کو ٹھوکر مارا۔ ادھلے تم کس کس کاٹھو پر اس سے مقابلہ کرو گے؟ کیا تم اس بات کو بھول گئے کہ تمہارا کھانا کھانا کیا؟“

”جب اس کے پاس پیشہ ور قاتلوں کی کمی نہیں ہے تو اس نے آپ کے قتل کے میرا انتخاب کس لئے کیا؟“

”شاید اس لئے کہ میں اس کے قریب میں آ جاؤں گی۔ جو قاتل بھی میرے قتل ارادے سے نکلا اسے راستے سے ہی ناکام واپس جانا پڑا۔ کیونکہ میرے آدمیوں نے کی ایسی درگت بنائی اور ایسا سبق دیا کہ وہ ادھر کارخ کرنا بھول گئے۔ مجھے نہیں معلوم ان کی تعداد کتنی تھی۔ تم نے صرف خوش قسمتی سے زندہ بچ گئے بلکہ یہاں تک پہنچنے کا ایسا بھی ہو گئے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا ہوا تھا کہ تم زندہ سلامت ہی نہ جا سکو۔ تمہاری لاش کسی ندی یا گڑھے میں پھینک دی جائے۔ میں نے چاروں رف اپنا چال پھیلا رکھا ہے۔ مجھے اپنے دشمن کی حرکت و سکنت کی پہلی ہی خبر پہنی ہے۔ کوئی میری اجازت کے بغیر یہاں دم نہیں مار سکتا ہے۔ آس پاس کے بہت علاقوں پر میری عملداری قائم ہے۔“

”آپ مجھے اور ایس الحق سے کس لئے خوفزدہ کر رہی ہیں؟“ میں نے اس کے پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

”خوفزدہ نہیں کر رہی ہوں بلکہ تمہیں بتا رہی ہوں کہ وہ کس قدر خطرناک شخص

”آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“ میں نے بے پودائی سے اپنے شانے

ہے، قیافہ شناس ہے۔ انسانی مجبوریوں اور نفسیاتی کمزوریوں سے خوب فائدہ اٹھاتا جانتا ہے۔ بہت اچھا اداکار ہے۔ اس کے پاس جتنی دولت ہے شاید ہی کسی کے پاس اس دیش میں ہو۔ اس کے علاوہ وہ انتہائی ہارٹر، طاقتور اور بے رحم ہے۔ اس نے شاید کبھی اپنے والدین پر بھی رحم نہیں کھایا ہو گا۔ وہ اپنے دشمن کو ایسی اذیت دے کر مارتا ہے کہ ہلاکو اور جینگیر خان کی روحیں بھی شربا جاتی ہوں گی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بدترین دشمن ہیں۔ اس کے ذہن میں میرے خلاف نفرت اور انتقام کے جنون کا جو زہر بھرا ہوا ہے تم اس کا رتی بھر اندازہ بھی نہیں کر سکتے ہو۔ میں اس کے راستے کا ایسا پتھر ہوں کہ جسے ہٹانے کے لئے وہ اپنی پوری طاقت صرف کر رہا ہے اور پتھر ہے کہ پانی کی طرح بہائے پھلا جا رہا ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے کسی معقول جواز کو سن کر تمہاری اس بات پر یقین کر لے گا؟ ہرگز نہیں۔“

”معتول بات ہوئی تو اسے یقین کرنا پڑے گا۔ میں اسے ہر طرح سے یقین دلائے گی کہ وہ کوشش کرے گا۔ پھر دوسری صورت میں کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔“

”اسے کوئی بات سمجھانا آتا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو، تم کہیں بھی چلے جاؤ اس کے آدمی دشاری کتوں کی طرح تمہاری ہوسو گھر کر تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ آج تک کوئی بھی ان کے ہاتھ سے بچ کر کہیں جانیں سکا ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے میں اس کے کتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر دوں گا۔“ میں نے اعتماد سے کہا۔

”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنی چالاکائی، ذہانت اور جرأت سے ان کے عزائم خاک میں ملا دو گے تو یہ تمہاری جہالت ہے۔“

”میں ایک سپاہی ہوں۔ میدان جنگ میں دشمن سے لڑ چکا ہوں۔ میں آخری سانس تک اور ایس الحق اور اس کے پانچو کتوں سے لڑوں گا۔ ان کے لئے ناقابل شکست بن جاؤں گا۔“ میں عزم و حوصلے سے بولا۔

”میں کوئی ایسی تدبیر کر لوں گا کہ اس کی رسائی مجھ تک نہ ہو سکے۔ میں کس طرح

سے اس کے زیرِ حُکْم آنے سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں ادا ہے۔ میں اس صورت میں بیٹھ سکتا ہوں کہ گمشدگی کی زندگی اپنے دیش کے کسی دورِ افتادہ مقام پر خاموشی سے ایک عام جسم کے آدمی کے ہمیں میں گزار دوں..... یا پھر قانونی طور پر سرحد پار کر کے کلکتہ چلا جاؤں۔ ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے کہ اس کے کسی بھی گوشے میں چلا جاؤں تو اس کے فرشتے بھی میری گردنیں پاسکتے۔“

”یہ تو بزدلوں کی زندگی ہوتی۔“ اس نے مجھے جھٹنہ دیا۔ ”ایک سپاہی کو زینب نہیں دیتا کہ وہ چرے کی طرح چھپ جائے۔“

”کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں واپس جا کر اس کے سینے میں ریو الوہ کی ساری گولیاں ایک ایک کر کے اُتار دوں؟“ میں نے تجزی سے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے اپنا سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کی چادر تن گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک ابھری۔ ”تم نے سنا ہو گا کہ گیدڑ کی سوسلاہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی آزادی کی زندگی بہتر ہوتی ہے۔ اسے قتل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ تم اسے نشانہ بنانے سے پہلے خود نشانہ بن جاؤ گے۔ اس کے لئے کوئی منصوبہ بنانا ہو گا۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے اپنے دشمن کے قتل پر آکساری تھی۔

”میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتی ہوں جو کسی بھی لحاظ سے گھمٹے کا نہیں ہو گا۔“

”کیسا سودا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اور میں الحق نے جنہیں مجھے قتل کرنے کا جو معاوضہ دیا ہے میں اس کے مقابلے میں چار گنا دینے کے لئے تیار ہوں..... یا پھر تم میری ہتھکڑیاں اور اس الحق کو قتل کرنے کا کیا معاوضہ لڑینگے؟“

”آپ انسانیت کے حیلے بھانے مجھ سے ایک پیشہ ور قاتل کا کام لینا چاہتی ہیں۔“

”جیسے مجھے بچے میں کہا۔“ کیا پورے دیش میں صرف میں ایک ہی شخص رہ گیا ہوں

”میں آپ کی بات کا اعلان بغیر کیا۔“ مجھے آپ کی یہ پیشکش نا منظور ہے۔“

”وہ کس لئے؟“ اس کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ ”کیا انکوں کی رقم ہے؟“

”اس لئے کہ میں پیشہ ور قاتل نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے نزدیک

ادعائت گری ایک وحشیانہ فعل ہے۔ آپ میں لاکھ کی رقم بھی دیں گی تو میں اسے

نہیں کرؤں گا۔ وہ آپ کا دشمن ہے۔ آپ خود ہی اس سے نہیں۔“

”مگر تم جو مجھے قتل کرنے آئے ہو کیا وہ کوئی نیک کام تھا؟“ اس کے لیے میں طوکی

تھی۔

”میں آپ کو اس کی وجہ بتا چکا ہوں کہ مجھے بلیک میل کر کے آپ کے بارے میں

بیانی سے کام لے کر مجبور کیا گیا۔ اب جبکہ آپ کی شخصیت کے اچھے پہلو سامنے آ

تو میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اور میں الحق کو قتل کرنے کے لئے..... کیا آپ کسی بد معاش کی خدمات حاصل نہیں کر سکتی ہیں؟“

”نہیں..... تم غلط سمجھ رہے ہو۔ تم پیشہ ور قاتل کا نہیں بلکہ ایک سپاہی ا کردار ادا کرو گے۔ ایک ایسے شخص کو قتل کرنا جو بے خمیر وطن فروش اور بے رحم کا ثواب ہے۔ میں نے بہت سارے بد معاشوں کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن لاچھی، جموں نے اور دغا باز ثابت ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف ذہل کر اس کیا بلکہ رقم بھی ہڑپ کر لی۔ کچھ تو اور میں الحق کے بد معاشوں کے ہتھے چڑھ کر اپنی زندگی سے محروم گئے۔ کچھ بچ گئے۔ مجھے تم پر اعتماد ہے تم بچو گے نہیں۔“

”آپ کا مجھ پر غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ اس وقت میں ایک ناقابل مجرورہ شخص کی شکل میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔“

”تم ناقابل مجرورہ کیسے ہوئے؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”وہ ایسے کہ میں اور میں الحق کا آدمی ہوں۔ اس نے مجھے نہ صرف بلیک میل کے بلکہ مجرورہ کر کے آپ کو قتل کرنے کے لئے بھیجا۔ اگر میں آپ سے سودا کر لا ہوں تو ناقابل مجرورہ ہوا۔ جو شخص ایک سے وعدہ کر کے اس کے اعتماد کو نہیں بچتا ہے وہ دوسرے کے اعتماد کو بھی نہیں بچتا سکتا ہے۔ ایسے شخص کا کیا اعتبار؟ اگر میں آپ کے دشمن سے کوئی نیا سودا کر لیا تو.....“

”مجھ میں اور اور میں الحق میں بہت فرق ہے۔“ وہ مجھے سمجھانے کے انداز کہنے لگی۔ ”وہ ایک مافیا حقیقہ کا سربراہ ہے۔ میں اس کے برعکس وطن پرست ہوں مجھے امید ہے کہ تم ایک جراثیم پیشہ کے کہنے پر نہیں چلو گے۔“

”میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ ایک مافیا حقیقہ کا سربراہ ہے؟ اس کی حقیقہ سر کر میاں کیا ہیں؟ کیا آپ بتا سکتی ہیں؟“

”وہ ایک اسلحہ فروش حقیقہ ہے۔“ وہ کہنے لگی۔ ”وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ

فروخت کرتی ہے جو ملک دشمن عناصر ہیں۔ جو تحریکی کارروائی کرتے ہیں اور ایسی سیاسی پارٹیوں کو جو بددق کے زور پر ملک میں تباہی لانا چاہتے ہیں۔ سیاسی اجتماعات میں، پبلک مقامات پر ٹریل گاڑیوں اور سٹیروں میں جو بم بچھتے ہیں وہ اسی حقیقہ کی کارستانی ہوتی ہے۔“

”کیا حکومت اور اعلیٰ جنس کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ ملک میں تحریکی کارروائیاں کون کرتا ہے؟ کیا اس حقیقہ کا آج تک ایک فرد بھی پکڑا نہیں جا سکا؟“ میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

”جو لوگ پکڑے گئے انہیں جیل یا حراست کے دوران ہی قتل کر دیا گیا۔ اس لئے ہمیں پردہ چھو سامنے نہ آ سکا۔“

”تو آپ نے قانون کی مدد نہیں کی؟ اسے بے نقاب نہیں کیا؟“

”نہیں..... اس لئے کہ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ وہ چونکہ حکومت کی نظر میں ملک کی حقیقہ شخصیت ہے۔ اس لئے میں آج تک اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی ہوں۔“

”وہ آپ کا اپنے راستے کا پتھر کس لئے سمجھتا ہے؟“

”اس لئے کہ میں نے اس کی کئی ایسی لانچوں کا چاہ و برباد کر دیا جو غیر ملکی اسلحہ وطن دشمنوں کو پہنچانے کے لئے نقل و حرکت کر رہی تھیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بعض اوقات مجھے ٹاکسیوں کا نہ بھی دیکھنا پڑا لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ جب کبھی میرے علم میں یہ بات آ جاتی ہے کہ فلاں لانچ اسلحہ لے کر جاری ہے تو پھر اسے راستے میں چاہ کر دیا جاتا ہے۔“

”آپ کو قانون کو ہاتھ میں لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے حکومت کو مطلع کر دیا ہوگا۔“

”جب کبھی بھی میں نے اس کی ایسی لانچوں کی نقل و حرکت کی اطلاع پولیس کو کی

تو اسے جھوٹ سمجھا گیا۔ اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ جب میں نے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کیا تو کئی سمجھڑیوں نے اسے پہنچی اطلاع دے دی۔ اس نے اپنی لائنوں کو چھپا دیا پھر ان کا رخ تبدیل کر دیا۔ پھر میں نے ٹک آکر اس کے خلاف محاذ بنالیا اور اپنے تئیں اس کے خلاف سرگرم عمل ہو گئی۔

”وہ اس قدر طاقتور اور بااثر ہوتے ہوئے بھی آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکا؟“

”اس لئے کہ میں ایک ریٹائرڈ جنرل کی بیٹی اور اس کی بیوی ہوں۔“ اس نے دھجے

لے میں جواب دیا۔

”بیوی؟“ میں بھونچا رہ گیا۔

”ہاں۔“ اس نے اپنا خوشنما سر ہلایا۔ پھر وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ ”جس

وقت اور ریس الحق سے میری شادی ہوئی تھی وہ معمولی سا برنس مین تھا۔ میرے ٹانے

اسے میرے لئے پسند کیا تھا۔ میرے ٹانے اس کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ وہ بلا کاڈیون

اور ایک بہت بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے اپنی دولت عیاشیوں کی نذر کر

دی تھی۔ میرے کاروباری ٹانے اسے ترازو میں تولتا تھا۔ اس میں اور خوبیاں جو تمہیں وہ

ٹائوی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کے نزدیک اس کی کاروباری صلاحیتیں پیش نظر تھیں۔ وہ

خود بھی بہت بڑے کاروباری اور امیر ترین آدمی تھے لہذا چٹ مٹتی اور پتہ بیاہ ہونے میں

دیر نہیں لگی۔ میرے ٹانے اسے کاروبار کے لئے بڑی رقم دی تو دو سال کے عرصے میں

اس نے ایک ہزار برنس مین بن کر دکھایا۔ ٹانے نے اپنی ساری دولت اور جائیداد میرے نام

کر دی تھی۔ وہ ہماری شادی کے چھ برس تک زندہ رہے۔ اس نے ان کے انتقال کے

بعد لائیں، سینئر اور کوچوں کی خریداری شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے

ملک میں ٹرانسپورٹ کے کاروبار کا جال بچھا دیا۔ اس نے پدماریور کارپوریشن قائم کر لی

تھی۔

”والدین ٹانہ کی موت کے بعد مستقل طور پر امریکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ والدین

کی علالت کی خبر سن کر میں امریکہ گئی تو مجھے چار سال تک وہاں رکنا پڑا۔ اس نے میری کئی محسوس کی اور نہ ہی اس نے وطن اپنے آپ کو ہراساں کیا تھا۔ جو کہ اس کے پاس بے پناہ دولت تھی اس لئے میری کسی دوسری عورتیں پوری کرتی رہیں۔ والدین کے انتقال کے بعد جب میں اپنے وطن آئی تو پتا چلا کہ وہ اس ملک کی بہت بڑی شخصیت بن چکا ہے۔

اس کے پاس جو دولت تھی اس کا راز یہ تھا کہ وہ باغی تنظیم کا سربراہ ہے۔ بین الاقوامی

ہٹلے اس کا تعلق ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھا لیا کہ وہ وطن فروشی نہ کرے۔ آخر وہ

تنی دولت کا کیا کرے گا؟ اس نے میری ایک نہ مانی۔ پھر ہم دونوں کے درمیان فاصلے اور

فرت کی خلیج بڑھتی گئی۔ ایک روز ہمارے درمیان دھڑست تلخ کلاہی ہوئی۔ پھر میں اس

سے الگ ہو گئی۔ پھر میں نے حکومت کے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے خلاف

کلیات کی۔ انہیں بتایا کہ یہ شخص ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ وہ میری یہ بات

نہیں کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے ثبوت مانگا۔ میرے پاس اس کے خلاف

کوئی ثبوت نہ تھا۔ پھر میں نے اپنے ٹانے کو دوستوں کی مدد سے ایک تنظیم بنائی۔ اپنے

لوگوں کے جوانوں کو بھرتی کیا۔ انہیں تربیت دلائی۔ پیشہ ور بہ معاشروں کی خدمات بھی

محل کیں۔ میں نے اس گاؤں میں آکر یہ حویلی خریدی اور یہاں رہائش اختیار کر لی۔

یونکہ یہ بہت محفوظ ترین علاقہ ہے۔“

وہ خاموش ہوئی تو میں نے چند لمحوں کے بعد کہہ۔ ”میں بغیر کسی معاوضے کے آپ

ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ مجھے کہیں بھی، کبھی بھی اور کسی بھی وقت بھیجے

میں نہیں گی۔ مجھے اپنے وطن کی سلاستی اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔“

”اور ریس الحق کا خاتمہ ہو جائے گا تو اس کی تنظیم بھی ختم ہو جائے گی۔ میں یہ وہ

گی۔ مجھے سدا کے لئے آزادی مل جائے گی۔“

”کیا اور ریس الحق نے آپ کو طلاق نہیں دی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”نہ میں نے اس سے طلاق کے لئے کہا ہے۔ اس

کے طلاق دینے اور میرے لینے سے ایک سیٹل کھڑا ہو جائے گا۔ میں ایک ایسے جزل کی بیٹی ہوں جس کی ملک اور عوام میں بڑی عزت ہے۔ اس کام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ اور ایسے الٹی ایک ایسی شخصیت کا مالک ہے جو سرکاری اور عوامی سطح پر عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ دوسری طرف میرے خزن کا اس لئے بھی بڑا سا ہے کہ میری کمزوریوں کی دولت اور جائداد پر قابض ہو سکے۔ میری موت کے بعد اسے یہ سب کچھ مل جائے گا۔“

صورت حال اب مجھ پر روز روشن کی طرح عیاں ہونے لگی تھی۔ دراصل یہ جنگ دولت کے حصول کی تھی۔ میان پوری ایک دوسرے کے حریف تھے۔ دونوں کے شاطر ذہن ایک سے تھے اور ان میں سے کوئی بھی کسی کو کم تر نہیں سمجھتا تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ جنگ کا نسائی اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ حق و غلط تقدیر کا نہیں بلکہ تدبیر کا کھیل ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے وسائل اور قوت کا اندازہ تھا لیکن اب حالات ان دونوں کو اس مقام پر لے آئے تھے کہ جہاں وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن سے زیادہ کچھ نہ تھے اور ان کی دشمنی کے اسباب صرف ذاتی رہ گئے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک زندہ رہ سکتا تھا خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ میرے لئے یہ اندازہ کرنا زیادہ دشوار نہ تھا کہ اب ان دونوں کے لئے زندگی کا مقصد مار دینے یا مرنے کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں مارنے جانے کے اندیشوں میں مبتلا رہ کے جینا دونوں کی طبیعت اور تربیت کے تقاضوں کے برعکس تھا۔

یہ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے اور ایسے الٹی کی بے خمیری اور وطن فروشی کی بڑا کمائی سنائی ہے اس میں کتنی صداقت ہے؟ یہ من گھڑت کہانی بھی ہو سکتی تھی لیکن مجھے اس کہانی میں مبالغے کا شبہ تک محسوس نہیں ہوا تھا لیکن ابھی حتی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ میں بغیر کسی تحقیق کے کسی کی جان نہیں لے سکتا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو کیپٹن صبر احمد؟ عالیہ کی ریلی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

اس وقت دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا آپ کے آدمیوں نے ان ٹھکانوں کا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی جہاں اسلحہ اور گولہ بارود رکھا جاتا ہے؟“

”ان ٹھکانوں کا پتہ لگنا چاہئے تو پھر بات ہی کیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”میرے آدمیوں اور پرائیوٹ سرائفروں نے سر توڑ کوشش کر لی لیکن اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اگر ان ٹھکانوں کا پتہ چل جائے تو میرے دشمن کی کراؤٹ جائے گی۔“

”آپ کے نزدیک اور ایسے الٹی کی موت زیادہ اہم ہے یا ان ٹھکانوں کی نشاندہی؟“

”اور ایسے الٹی کی موت۔“ وہ مردود سا کہ لہجے میں بولی۔

”فکس کئے؟“ میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

”اس کی موت سے سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ اسی لئے میں اس کی موت پر بہت زیادہ زور دے رہی ہوں۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”اب تمہارا یہ کام ہے کہ اس کی موت کا منصوبہ بناؤ۔ اسے کس طرح سے اور کیسے ختم کیا جاسکتا ہے اس کی تدبیر تمہیں کرنا ہے۔ تم اس مشن میں اکیلے نہیں ہو گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گی ہر قدم پر تمہارا ساتھ دوں گی۔ مگر میں کل کر سامنے نہیں آؤں گی۔ میں کوشش کروں گی کہ تمہاری مدد کے لئے سائے کی طرح ساتھ لگی رہوں لیکن تم میرے بھروسے میں نہیں رہنا۔ کیونکہ میرے دشمن سیکڑوں بد معاش ہیں جو اور ایسے الٹی کے ساتھ ہیں مجھے اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔“

اس نے اپنی ہاتھ پیٹ کر کے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ لمبھتے کمرے میں بڑی شان اور محنت سے چلی گئی۔ جو اس کی خواب گاہ معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اسی انداز سے واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا لفافہ تھا۔ اس نے لفافہ میری طرف پیدھا کر کے دیا۔ ”اس میں ایک لاکھ کی رقم ہے اسے لے لو۔“

میں نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے

الحق عدم آباد سدھار نہیں جاتا میں یہاں ایک دن بھی زندگی سکون سے گزار نہیں سکتا تھا۔

میں نے گھر پہنچ کر اسے اور آمنہ کو احتیاط میں لے کر علیہ کی کمائی سٹائی اور اپنے منہ کے بدلے میں بتایا تو وہ دونوں بھونچکے رہ گئے۔ ابو بکر جو پولیس میں ملازمت کر کے ریٹائر ہو چکا تھا۔ اس نے علیہ کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اس عورت نے جو کچھ کہا اس میں بڑی صداقت ہے۔ یہ آج تک پتا نہیں چل سکا ہے کہ وہ کون ہے جو غریب کاروں کو اسطرح فروخت کرتا ہے۔ اس نے پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کی کالی میزوں کو خرید رکھا ہے وہ چوہدری کے نام سے مشہور ہے۔ چوہدری کون ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا ہے۔ وہ بہت محتاط طریقے سے کام کرتا ہے۔ وہ اس قدر ذہین اور چلاک ہے کہ اسے پولیس صحرائی لومڑی کہتی ہے۔“

”اب تو یہ پتا چل گیا کہ چوہدری اور صحرائی لومڑی کون ہے۔ علیہ نے ان ناموں کا فائدہ سے جو ذکر کیا تھا۔ میں کل ڈھاکہ جا رہا ہوں۔ پہلے تو ادریس الحق سے مل کر غلط بیانی سے کام لوں گا پھر میں اس کے خلاف کوئی منصوبہ بناناں گا۔“

”میں بھی تھملے ساتھ چلوں گا۔“ ابو بکر نے کہا۔

”تمہیں ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ آمنہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ ”میں نہیں برس کے بعد تو تمہیں گھر میں بیٹھنا نصیب ہوا ہے کیوں اپنی جان مفت میں نولے لگے ہو؟“

”یہ میرا تمہارا مصیور کا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔“ ابو بکر بھڑک گیا۔ ”یہ ملک کی سلامتی مسئلہ ہے۔ یہ ملک نہ رہا تو کچھ بھی نہ رہے گا۔ میری زندگی، میرا جینا مرنا وطن، میرے لئے ہے۔“

”آمنہ بھائی ٹھیک کہتی ہے۔“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”جذباتی خوش و دشمن سے تھانٹ لوں گا مجھے اللہ پر اور اپنے ہاڑدوں پر پورا بھروسہ ہے۔ اگر

کہا۔“ میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ سے کہا تھا کہ میں ایک وطن فروش کو غصہ کرنے کا کوئی معروضہ نہیں لوں گا۔ یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں اسے موت کی نیند سلا دوں۔“

”یہ رقم تمہارا معروضہ نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”میں تمہیں ان اخراجات کے لئے دے رہی ہوں جو دشمن کے دوران پیش آئیں گے۔ اس دشمن کی کامیابی کے بعد میں تمہیں معروضہ نہیں بلکہ ایسا انعام دوں گی جو ساری زندگی کام آئے گا۔“

اس سے باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے کھانے پر روک لیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ایک معزز مہمان جیسا سلوک کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک جزل کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنے باپ کا جو نام بتایا تھا وہ ایک بڑی ہستی کا تھا۔

کھانے کی میز پر اس سے باتیں بھی ہوتی رہی تھیں۔ انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بوئے اصرار سے کھلایا تھا۔ بڑے عرصے کے بعد مجھے یہاں لذیذ اور ذائقہ دار کھانے ملے تھے۔

☆-----☆-----☆

ابو بکر کیتوں میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں حویلی والے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ میرے لئے بہت بے چین اور پریشان ہو رہا تھا۔ اسے دوسرے اور اندیشے سائپوں کی طرح ڈٹے رہے تھے۔ اس نے مجھے دور سے آتے ہوئے دیکھا تو اس کا چہرہ دکھ اٹھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے لپکتا ہوا میری طرف آیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اس نے جو سوال کئے اس کے میں نے مناسب جواب دیئے۔

میں بہت تھک گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ میں ایک عام آدمی کی طرح سکون اور عالت سے اپنے گاؤں میں زندگی گزار دوں۔ جہاں میری زندگی پر کسی اور کا اختیار نہ رہے لیکن یہ میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ جب تک میرا دشمن پورا نہیں ہو جاتا اور لیس

”تم اس کے تعاقب میں کھانا کیوں نہیں گئے؟“ اور یس الحق کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
”تم میرے پاس چند جیسائے کرکس لئے آئے ہو؟“

”میں آپ کو رپورٹ دینے کے لئے آیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم یہ بات مجھ سے ٹیلی فون پر بھی کہہ سکتے تھے الحق!“ اس نے اضطراب سے پہلو دے لے ہوئے کلمہ۔ ”تم اس وقت ہوئی جہاز سے کھانا روانہ ہو جاؤ۔ کھانا میں میرے دفتر کے بڑے رہتے ہیں۔ میں تمہیں ان کے نام پتے دے رہا ہوں ان سے ملو۔ رابطہ رکھو۔ یہ تم سے ہر طرح کا تعاون کریں گے۔ شاید دو ایک دن بعد میں بھی وہاں پہنچوں۔“

”میں دوسری فلائٹ سے روانہ ہو جاؤں گلب آپ مجھے اپنے آدمیوں کے نام پتے اور ٹیلی فون نمبر دے دیں۔“

”میں تمہیں آخری چانس دے رہا ہوں۔“ وہ ٹھکانہ لیے بیٹھ بولا۔ ”اگر تم اس ہلہ ناکم ہوئے تو پھر میں تمہاری دستاویزات قانون کے حوالے کر دوں گا۔ ایک بات یاد رکھو پھر تم عرقیہ باضعت یا پانسی کی سزا پاؤ گے۔“

”اگر میں ناکام ہو گیا تو خودکشی کر لوں گا۔“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کلمہ۔ ”عالیہ اب میرے ہاتھ سے بچ نہ سکے گی۔“

”ٹھکانی کی صورت میں تمہارے لئے خودکشی ہی زیادہ مناسب ہے۔“ وہ بے رحمی سے بولا۔ ”اگر تم نے عالیہ کو قتل کر دیا تو میں تمہیں سرہانہ زور دوں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا سرہانہ زور کیا ہو گا۔ کاسیانی اور ٹھکانی کی صورت میں وہ مجھے صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کرے گا۔

میں نے ایک پبلک کال آفس سے عالیہ کو ٹیلی فون کر کے اور یس الحق سے ہونے والی تمام گفتگو بتائی۔ میں نے اسے اپنے پروگرام کے بدلے میں بتایا۔ میں نے اس سے

تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں بلا لوں گا۔“
میں دوسرے دن علی الصبح ڈھاکہ شہر کے لئے روانہ ہو گیا۔ میں تمام راستے سوچتا رہا کہ مجھے اور یس الحق سے کیا باتیں کرنا ہیں۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ آیا تھا وہ اس کے ہر پہلو کا جائزہ لے رہا تھا۔ کتنی عجیب سی بات تھی کہ اب میں اور یس الحق کے دشمن کا دوست بن کر اس کے لئے فرشتہ اجل بن کر جا رہا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس کی موت میرے ہاتھ لکھی ہے یا میری موت اس کے ہاتھ۔

جب میں پہلی بار اور یس الحق سے ملنے گیا تھا تو اس وقت میں نے اس کے حفاظتی اقدامات پر غور نہیں کیا تھا۔ ڈھاکہ پہنچ کر دوسرے دن اس سے ملنے پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ فکرت نہ آنے والے حفاظتی حصار میں ہے۔ جب میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔ ”تم ٹھکانی کی سیاسی اپنے منہ پر مل کر آئے ہو۔“

”میں بڑی مشکل سے اس کے ہاتھوں سے جان بچا کے آیا ہوں۔“ میں نے اسے بد معاشوں کے ہاتھوں بٹنے اور ایک ہفتہ تک ماحول مقام پر اپنی کسی عمن کے ہاں زیر علاج رہنے پھر عالیہ سے ڈرامائی اور پراسرار ملاقات اور اس کی جان سے ملہ دینے کی دھمکیوں کے بارے میں بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ میں نے کس مشکل سے وہاں سے فرار ہو کر اپنی جان بچائی۔ پھر میں نے اسے من گھڑت واقعہ بھی سنایا کہ عالیہ پر میں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا لیکن وہ مجھ سے بھڑانے طور پر ہاں بیل بچ گئی۔ اس نے مشتعل ہو کر میرے پیچھے شکاری کتوں اور بد معاشوں کو لگا دیا تھا۔ بات کا وقت تھا میں عدی میں کود کر اپنی جان نہیں بچاتا تو اس کے کتے مجھے چیرھاڑ کر اور اس کے ہاتھ بد معاش مجھے بھون کر رکھ دیتے پھر وہ ملے کے دوسرے دن پراسرار طور پر گاؤں سے غائب ہو گئی۔ میں نے اس کے ایک ملازم سے بات کی تو اس نے بتایا کہ عالیہ کھانا کی طرف گئی ہے کیونکہ رات بارہ بجے اسے کھانا شہر سے ٹیلی فون آیا تھا کہ چان پورٹ سے بہت سارا اسلحہ لائیں میں سمجھ گیا ہو کر آ رہا ہے۔ وہ اسلحہ اور لائیں کو تیار کرنے کے لئے فوراً روانہ ہو گئی۔“

چلا جاؤں وہیں سے غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے کلکتہ نکل جاؤں۔ جیسوہر میں ایسے ایجنٹوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو معمولی سی رقم کے عوض کسی بھی شخص کو مل اسباب سمیت سرحد پار کرا دیتے ہیں۔ اس وقت میرے پاس ادیس الہی اور عالیہ کی دی ہوئی جو رقم ہے وہ لاکھوں میں ہے۔

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ عالیہ اپنے شوہر کی دولت اور ذاتی مفاد کے لئے میدان میں نہیں کودی ہے۔ وہ اس کی موت کی خواہش اس لئے نہیں ہے کہ ادیس الہی سے اس کا سب کچھ حاصل کر لے، اس کے سامنے ایک مقصد ہے، ایک نظریہ ہے، ایک عظیم فوجی جرنیل کی بیٹی ہونے کے ناتے وہ ملک کی سلامتی کے لئے اپنا سانس اجاڑنا چاہتی ہے۔ اس کے جذبے میں کین بھی ذاتی اغراض کی بو نہیں آتی ہے۔ اس نے کئی بار قانون سے مدد لینا چاہی لیکن قانون اس کی کوئی مدد اس لئے نہیں کر سکا تھا کہ اس کے پاس ادیس الہی کے خلاف کوئی ثبوت نہ تھا، جس نے چوہدری کی شخصیت میں ہتھ لے رکھی تھی۔ میں عالیہ کی مدد کرنے کے لئے ہر طرح سے تیار تھا۔ میرے دل میں بھی وہی جذبہ موجزن تھا جو عالیہ کے دل میں تھا۔

میں نے ہوٹل میں کمرہ لینے کے بعد اپنی رقم کلائنٹر پر جمع کرادی۔ میں نے دس ہزار کی رقم بوقت ضرورت کے لئے جیب میں رک لی۔ میں ٹیسی لے کر گھٹ پر اس جگہ پہنچا نہں ادیس الہی کا درکشاپ تھا۔ اس درکشاپ میں لانچوں، موٹوں اور سیفروں کی مرمت ہوتی تھی۔ اس وقت بھی دول لانچوں کے اندر وہی ادیس الہی صحنوں میں کام ہو رہا تھا کیونکہ آواز میں آ رہی تھیں تاہم مجھے درکشاپ کے گیٹ پر روک لیا گیا۔

گیٹ پر جو دو رہن تھا وہ اپنے چہرے سے سرے اور وضع قطع سے پیشہ ور قاتل کی طرح رہا تھا۔ اس نے شین گمن کی ٹیبل میرے سینے پر رکھ کر مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا خت لہجے میں بڑی بدتمیزی سے بولا۔ ”کون ہے تو.....! یہاں کس لئے آیا

یہ بھی کہا کہ میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیرا اپنے نشانے پر جاگنا ہے۔ غیر ملکی اسلحہ کھانا شر پہنچا ہے پھر وہیں سے اسے ملک کے مختلف گوشوں اور شہروں میں پہنچایا جاتا ہے۔ ادیس الہی وہاں ایک دو دن میں کھانا پیچھے والا ہے۔ آپ آنا چاہیں تو آجائیں ورنہ میں اکیلا ہی اس سے ختنے کی کوشش کروں گا۔ عالیہ نے مجھ سے کہا کہ میں ہوٹل ڈی کس میں تیسری منزل کے کسی کمرے میں ٹھہروں۔

میں سہ پہر کے وقت ہوائی جہاز سے کھانا شہر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ہوٹل ڈی کس کی تیسری منزل پر عالیہ کی ہدایت کے مطابق کمرے لیا۔ تیسری منزل پر کمرہ کرائے پر لینے میں کیا معلومات تھی۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس کی تہہ میں شاید کوئی بات تھی مجھے اس سے پوچھ بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ میرا مشن ادیس الہی کو موت کی نیند سلانا تھا۔

میں ہوائی جہاز میں سفر کے دوران عالیہ کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچتا رہا تھا۔ میں اب ایک بیٹیلیس برس کا شخص تھا روانوی باتوں میں اب میرے لئے کوئی جاہلیت نہیں رہی تھی مگر آج میں اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کر رہا تھا مجھے اپنی کوتاہی پر پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے اپنا کیریئر نہیں بنایا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ عالیہ کے حسن و خباب نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ مگر اس کے بارے میں سوچتا اور اس کا خواب دیکھنا حماقت تھی۔ وہ آکاش کے سینے پر جھگڑتے ہوئے چاند کی طرح تھی جسے میں ساری زندگی چھو نہیں سکتا تھا۔ میں ذہن تھا وہ آفتاب تھی۔

میں نے اپنے آپ کو ٹیٹلا کہ میں کس جذبے کے تحت اس کے زیر اثر آ گیا۔ میں اس کے کہنے پر کیا ایک پیشہ ور قاتل کا کردار ادا نہیں کر رہا ہوں۔ میں ایک سپاہی ہوں مجھے اس طریقے سے قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔ قانون، قانون ہوتا ہے، وہ کبھی مجرموں کی پشت پناہی نہیں کرتا۔ پولیس کے گھگھے میں نیچے سے اوپر تک ہزاروں کالی بھیڑیں کیوں نہ ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب بھی وقت ہے کہ میں جیسوہر

دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”تمہارے بڑے صاحب نے تم سے اور تو قیاد اور جہاد سے رابطہ رکھنے کے لئے کہا ہے تاکہ ہر وقت تم لوگ مجھ سے تعاون کر سکو جاؤ کب اور کس وقت تم لوگوں کی مدد کی ضرورت پڑ جائے۔“

فیشن ایک نخت ایک جھگڑے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر دہشت سی چھا گئی۔ وہ کچھ پریشان سا دکھائی دینے لگا۔ وہ مجھ سے تدریجی طور پر بولا۔ ”تم کل صبح یہاں آ کر مجھ سے مل لینا۔ میں اس وقت ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ میں پوچھ بیٹھا۔

”جان پورٹ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہماری تین لائفیں ایک غیر ملکی جہاز سے امدادی سلمان اٹکرنے گئی ہوئی ہیں جو طوفان زدگن کے لئے علیحدہ سے آیا ہوا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ عالیہ کے آدمی ہماری ان لائفوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ وہ شیطان عورت اب تک ہماری متعدد لائفیں چاہ کر چکی ہے اب اسے ایک بھی لالچ چاہ کرنے یا نقصان پہنچانے کا موقع کسی قیمت پر نہیں دیتا ہے۔ وہ اتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئی ہے۔“

”کیا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کس لئے؟“ اس نے چونک کر حیرت سے میری صورت دیکھی۔

”اس لئے کہ عالیہ کے آدمیوں سے مقابلہ ہونے کی صورت میں کچھ مدد کر سکوں۔“ میں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”ہمارے آدمی اس سے نمٹ لیں گے۔ اسلحہ اور آدمیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ تم جا کر یہ معلوم کرو کہ وہ کس بہروپ میں ہے اور کہاں غمیری ہوئی ہے۔ اس کا پیسہ ہی پتہ چلے اسے ختم کرنے میں ایک بل کا بھی تاخیر نہیں کرنا۔ تم کو کوئی آج آئی تو اسے ہم سنبھال لیں گے۔ اگر اس کے آدمی

اس کا انداز عکاظ مجھے سخت ناگوار لگا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی کمرش نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ میں نے بڑی نرمی سے کہہ "میں ڈھاکہ شہر سے آیا ہوں مجھے اور دس الحق نے بھیجا ہے۔ مجھے ڈھاکہ سے ملنا ہے۔"

وہ اور بس الحق کا نام سنتے ہی نرم پڑ گیا۔ اس نے ایک لالچ کے عرشے پر کلام کرتے ہوئے آدمی کو بلایا۔ پھر اس سے کہا کہ ویشاں صاحب سے کہو کہ وہاں کے شہر سے ایک صاحب ملے آئے ہیں۔ انہیں بڑے صاحب نے بھیجا ہے۔

۱۰ محض تیزی سے پلٹا ہوا رنای لالچ کے عرشے پر پہنچ کر زینے کی طرف دھا پھر نیچے چلا گیا۔ درہان نے مجھے دقت میں لایا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے سامنے ایک جلاو نما شخص کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ صاحب نے کس لئے بھیجا ہے؟“

”یہ اطلاع دینے کے لئے کہ عالیہ یتیم کھانا شہر پہنچ گئی ہے ہوشیار اور محتاط ہو جائیں۔“

”کیا؟“ وہ بری طرح چوکا پھر سنبھل کر بولا۔ ”چلو اچھا اب وہ میل سے فکری نہ جاسکے گی لیکن میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا، تم کون ہو، بڑے صاحب نے تمہارے ہاتھ یہ پیغام کس لئے بھیجا؟ وہ ٹیلی فون پر بھی اطلاع دے سکتے تھے؟“

”تمہارے بڑے صاحب نے عالیہ بیگم کو قتل کرنے کے لئے میری خدمات حاصل کی ہوئی ہیں۔ میں یہاں اسی لئے آیا ہوں۔ میں چونکہ یہاں آ رہا تھا اس لئے انہوں نے ٹیلی فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”کیا تم پیشہ ور قاتل ہو؟“ اس نے تیز و تند لہجے میں پوچھا۔

”نہم..... میں ایک رشتائے فوجی ہوں، فوج میں کمانڈر چکا ہوں۔“ میں نے

سرد مہری سے جواب دیا۔

”اس کے علاوہ تمہارے ذمے کوئی اور کام سونپا گیا ہے؟“ وہ مجھے گہری نظروں سے

لانچیں جہ کر کے فرار ہو گئے تو پھر یہ سمجھو کہ تسماری اور میری جان کی خیر نہ ہوگی۔
بڑے صاحب نہیں مروا دیں گے۔“

اتنا کہ کر زیشاں نے دفتری دیوار پر نصب ایک بٹن کو دھپا تو خطرے کا جیسا الارم
بیتے لگ۔ وہ چند لمحوں تک بچتا رہا توڑی دیر کے بعد وہ کشتاب میں جو لوگ تھے اور جو
لانچوں کے اندر دوچار کام کر رہے تھے وہ دوڑتے ہوئے دفتر کے اندر داخل ہو گئے وہ کوئی
پندرہ سولہ افراد تھے زیشاں نے ان سے کہا کہ وہ چپاٹائی لانچ پر ملیں۔

چپاٹائی لانچ ایک طرف ڈاک کے پاس کھڑی تھی وہ لوگ تیزی سے رٹناٹائی لانچ
کے عرشے سے ہوتے ہوئے اس پر سوار ہونے لگے۔ زیشاں مجھ سے ہاتھ ملا کر ان کے
پیچھے ہو لیا۔ توڑی دیر کے بعد وہ لانچ چل پڑی۔ بے حد تیز رفتار لانچ تھی جب لانچ
نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے دربان سے پوچھا۔ ”کس کس نام کی لانچیں جان
پورٹ گئی ہوئی ہیں؟“

”ستار گاؤں، آکاش اور جیون“ اس نے جواب دیا۔ ”ایک گھنٹے کی بات ہے وہ
تینوں لانچیں وہاں سے روانہ ہوئے والی ہیں۔ بڑے صاحب کی بیگم نے اپنے شوہر اور
ہمارے ناک میں دم کر رکھا ہے۔“

”اب وہ ناک میں دم کرنے کے لئے زندہ نہیں رہے گی۔“ میں نے سفاک لہجے
میں کہا۔ ”مگر وہ کھانا میں موجود ہے تو زندہ واپس نہیں جاسکے گی۔ کیا تمہیں معلوم ہے
کہ وہ یہاں آتی ہے تو کس ہوٹل میں ٹھہرتی ہے؟“

”وہ ایسا سرورپ بھر کے آتی ہے کہ اسے کوئی بھی پہچان نہیں پاتا۔ وہ عورت نہیں
لومڑی ہے۔ لومڑی۔“

میں اس سے توڑی دیر تک گپ شپ کر کے چلا آیا۔ اس سے میں نے غیر
محسوس انداز سے کچھ معلوم کرنا چاہا مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ وہ ایک کائنات محض تھا البتہ
اس نے بتایا کہ اس دو کشتاب میں صبح سات بجے سے شام چھ بجے تک کام ہوتا ہے۔

پرائی لانچوں کو خرید کر اندر سے ان کی حرمت کی جاتی ہے لیکن جو لانچیں وہاں کھڑی
تھیں جن میں کام ہوا تھا وہ کسی بھی طرح پرائی نہیں لگ رہی تھیں۔ جب ان کی ظاہری
حالت بہت اچھی تھی تو اندر کی حالت بھی اچھی ہو سکتی تھی۔ اس طرح دو تین موٹر
بوس پر بھی کام ہو رہا تھا۔ ڈاک پر جو سختے پڑے ہوئے تھے وہ سوئی اور بے حد مضبوط
لکڑی کے تھے۔ میرے دل میں شک کی ایک لہر اٹھی میں نے دربان سے پوچھا کہ کیا میں
اندر سے ان لانچوں کو دیکھ سکتا ہوں۔ اس نے سختی سے منع کر دیا۔ پھر میرے دل میں
شک کی لہر پختہ یقین میں تبدیل ہو گئی۔ دل میں کلاہی کلا تھا۔

میں نے ایک پبلک ٹیلی فون سے کوسٹ گارڈ کے دفتری فون کیا۔ آپریٹر نے
میری ایک افسر سے بات کرادی۔ وہ ایک ریٹائر فوجی کرنل تھا میں نے اسے بتایا کہ سندر
ڈاکس، آکاش اور جیون نامی لانچوں میں ایک غیر ملکی جہاز سے غیر قانونی اسلحہ لایا جا رہا

وہ لانچیں توڑی دیر کے بعد جان پورٹ سے روانہ ہو کر کھانا کی طرف آنے والی
ہیں۔ امدادی سامان سرکاری گوداموں کے ٹرینل پر انکار کر کہاں جاسیں گی میں یہ بتا نہیں
سکتا کیونکہ ان میں ان کی ایک حریف تنظیم سے فخر ہے کہ وہ ان کی لانچوں کو چاہ نہ کر
ے ان کی حریف تنظیم اب تک ان کی مشدد لانچوں اور موٹر بوسوں کو چاہہ وہ یہاں کر چکی
ہیں۔ اس چپاٹائی لانچ میں پندرہ سولہ پیشہ ورہد معاش بندہ قوتوں اور مشین گنوں سے مسلح

کرنل نے میرا شکریہ ادا کیا اور میرے اس جذبے کو سراہا کہ میں نے ایک عام
کی حیثیت سے قانون سے تعاون کیا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ ان میں سے کوئی
قانون کے ماتحتوں سے بچ نہ سکے گا۔ وہ فوراً ہی جان پورٹ کی طرف روانہ ہو رہا
تھا۔ مجھے کرنل سے بات کر کے بہت خوشی ہوئی تھی۔ فوجیوں کو خرید انہیں جاسکتا۔ وہ
بر اصول پسند اور وطن پرست ہوتے ہیں۔ ایک مجرم کتنا ہی بااثر اور طاقتور کیوں نہ

ہو وہ اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے جھپکتے یا خوف نہیں کھاتے۔

میں بیدار ہوا تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ میں نے اس وقت کو سٹ گاڑو کے دفتر میں کرل کو ٹیلی فون کیا۔ کرل کو ایک مختصر پہلے ہی اپنے دفتری کارروائی مکمل کر کے پہنچا تھا۔ اس نے میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ ان چاروں لائچوں کو سچ سمندر میں روک کر ان پر چھاپے مارا گیا۔ کسی بھی لائچ سے ایک رپو اور تک برآمد نہ ہو سکا۔ پچاسی لائچ میں پندرہ سولہ آدمی ضرور تھے لیکن ان کے پاس سے ایک چاقو تک نہیں نکلا۔ تینوں لائچوں پر امدادی سالن لدا ہوا تھا۔ امدادی سالن کی بھی جانچ پڑتال کی گئی ان میں سے کوئی قابل اعتراض چیز نہیں نکلی۔ آپ کی اطلاع جھوٹی ثابت ہوئی آئندہ آپ مصدقہ اطلاع دیکھئے۔

کرل کی جگہ کوئی پولیس افسر یہ بات کہتا تو مجھے اس کی بات کا بالکل یقین نہیں آتا مگر مجھے کرل کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ اسلئے ملتا میرا ان کی بات تھی اور میری سمجھ سے ہلاتر بھی۔ درہان نے مجھ سے کہا تھا کہ چپانای لائچ میں جدید ترین ہتھیار موجود ہیں جس سے لائچوں اور بڑے سیڑیوں کو بھی شدید نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ جو لوگ درکشاپ میں کام کرتے ہیں وہ کوئی عام مزدور نہیں ہیں وہ صرف میکینک ہیں بلکہ تربیت یافتہ ہیں اور ہر قسم کا اسلحہ چلانے میں مہارت رکھتے ہیں، میں بھونکا رہ گیا کہ وہ اسلحہ کہاں کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں لائچوں میں کسی ایسی جگہ چھپا دیا گیا جس سے کوئی برآمد نہ کر سکے اگر ایک بددق ہو تو ایسا ممکن تھا لیکن اسلئے کی کھپ کو چھپانا آسان نہیں تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کو سٹ گاڑو میں ایک سے ایک کالیں افسر موجود تھا وہی دھوکا کھا گئے تھے۔

قائد بادشاہیں ہوئی تھیں پہلی بات تو یہ تھی کہ کسی ممکنہ خطرے کے باعث اسلحہ لائچوں کے ذریعے پہلے ہی روانہ کر دیا گیا تھا پھر اسے جہاز سے انکار ہی نہیں کیا۔ یہ بات بھی ہو سکتی تھی کہ اسلحہ سمندر میں انکار دیا گیا ہو اور سمندر کے اندر سے ہی اسے کم

محفوظ جگہ پر پہنچا دیا گیا ہو۔ شاید اس حقیقہ نے ایسے افراد کی خدمات حاصل کر رکھی تھی جو سمندر کے اندر ہر قسم کے کام انجام دے سکتے ہوں۔ اس جدید دور میں کوئی بات ناممکن نہیں تھی۔

میں نے دل میں تیرہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح اس بات کا پتا لگا کر رہوں گا کہ اسلئے کی یہ کھپ ہے کہاں؟ کیسے کس طرح اور کن لائچوں کے ذریعے کہاں لے جایا گیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ میں کیوں اس پیڑے میں اپنی ٹانگ اڑا رہا ہوں۔ میرا مشن صرف اور صرف ادریس الحق کو قتل کر کے اس سے نجات پانا ہے اور عالیہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرنا ہے مگر میرے اندر ایک ضدی پیدا ہو گئی تھی ادریس الحق نے مجھے جو اذیت پہنچائی تھی میں بھی اسے ایسی اذیت پہنچانا چاہتا تھا۔ پھر اسے قتل کرنا چاہتا تھا اسے اذیت اس طرح پہنچانی جاسکتی تھی کہ اسلئے کی کھپ پکڑا دی جائے۔

میں تیار ہو کر اور ناشتہ کر کے ادریس الحق کے درکشاپ پہنچا تو صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے اس کے ڈاک پر تین لائچوں کو نقل انداز دیکھا۔ یہ وہی لائچیں تھیں جو حکومت کا امدادی سالن لانے چان پورٹ گئی ہوئی تھیں وہ سالن اندر کے ڈاک پر کھڑی تھیں۔ کل جن لائچوں کے اندر کام ہو رہا تھا ان میں آج بھی ہو رہا تھا۔

درہان نے مجھے ڈیشن سے ملنے لائچ پر جانے نہیں دیا۔ اس نے دفتری میں روک لیا اور ایک آدمی کو بھیج دیا کہ وہ ڈیشن کو بلا لائے۔ کوئی دس بارہ منٹ کے بعد ڈیشن آیا۔ میں نے اس دوران درہان سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ اس قدر سرد مری سے پیش آیا جیسے اسے شک ہو گیا ہو کہ میں عالیہ کا کارندہ ہوں۔ ڈیشن آیا تو بہت خوش تھا اس نے مجھ سے بڑی گرم جوشی اور تپاک سے ہاتھ ملایا میں نے اس سے پوچھا۔ ”رات خیریت رہی نا؟ عالیہ کے آدمیوں نے کوئی حرکت تو نہیں کی؟“

”خیریت کہاں تھی۔“ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”عالیہ نے اپنی پوری کوشش کر لی تھی کہ اسلحہ برآمد ہو جائے کرل نے بہت بھاری جہیت کے ساتھ چھاپے

”میں پہلی بار یورپ بھر کے نکلے ہوں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر گھٹاڑہ پر کھڑے آہٹے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنے آپ کو چند لمحوں تک تنہائی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”میں نے ان باتوں پر غور نہیں کیا تھا۔ بہر حال خطرے کی کوئی بات نہیں۔ میرے دو محافظ سامنے کمرے میں اور دو محافظ پیچھے موجود ہیں۔ تم اب بتاؤ۔ کیا ادیس اب الحق کھلتا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے سر ہلایا پھر میں نے کم سے کم الفاظ میں اسے رد واد سنائی۔
 ”یہ کیسے ممکن ہے کہ اسٹے کی ایک بڑی کھپ ان تین لائچوں میں چھپائی گئی ہو اور وہ نظروں آسکے۔“ عالیہ بھونچکی ہو کر بولی۔ ”تم اس بات سے اتنا اندازہ کر سکتے ہو کہ کس قدر کرپشن ہے لوگ کس قدر بکے ہوئے ہیں۔ وہ کس قدر بااثر اور طاقتور ہے۔ اس لئے تو میں حکومت کی کسی ایجنسی پر بغور نہیں کرتی اس لئے کسی نہ کسی طرح انہیں تباہ کر دیتی ہوں۔ میں آج ہی اپنے آدمیوں کو حکم دیتی ہوں کہ وہ ان چاروں لائچوں کو ڈوبنے کی کوشش کریں۔“

”انہیں ڈوب دینے میں آپ ہی کا نقصان ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میرا نقصان؟“

”اس لئے کہ کل آپ ان لائچوں کی مالک بننے والی ہیں۔ یہ آپ کی ملکیت ہوں گی۔“

”مجھے دولت کی ذرا بھی ہوس نہیں ہے میں اپنے خبیث شوہر کو اس قدر نقصان پہنچانا چاہتی ہوں کہ وہ ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جائے۔ ابھی وہ بڑے کرب سے دوچار ہے۔ مجھے دولت سے زیادہ وطن کی سلامتی عزیز ہے۔“

”حکمران کے بارے میں آپ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ غلط ہے میں آج رات بتا چلائے گی کہ کوشش کروں گا کہ لائچوں میں اسلحہ کھل چکا ہو رہا ہے۔ یہ کارگو لائچوں میں۔ ادیس اب الحق کی جتنی بھی لائچیں اور موزوں ہیں وہ کارگو کے لئے کم سنگنگ کے

صحت مند، تندرست توانا اور چاق و چوبند عورت تھی۔ وہ جوانی میں قیامت رہی ہوگی۔ آج بھی اس کی آنکھیں بہت خوبصورت اور نفیسی تھیں۔ میں اس کا تنہائی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے ایک دم چونک پڑا تھا۔ وہ کسی اور طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی تاڑ لیا تھا کہ عمر کی نقاب ایک دھوکا ہے جب وہ لفٹ سے نکل کر ڈانگنگ ہال کی طرف بڑھی تو اس کی چال کسی جوان لڑکی جیسی تھی۔ میک اپ کے باوجود ہاتھ نرم و نازک تھے اور کسی عمر رسیدہ عورت کے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بالوں کی سفیدی بھی مصنوعی تھی، میرے جیسے زمانہ شاس شخص کے لئے اصل اور نفیسی چروں کے فرق کو معلوم کر لینا ایک معمولی بات تھی۔

وہ جس میز پر جا بیٹھی میں بھی اس سے اجازت طلب کر کے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ دیش نازل ہوا تو اس سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد آئے۔ دیش چلا گیا تو میں نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ ”عالیہ بیگم! آپ کا میک اپ کس نے کیا ہے؟ جزئیات کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔“

عالیہ بھونچکی ہو گئی۔ ”میں..... تم نے مجھے پہچان لیا؟“

”میں کیا دشمن بھی آپ کو بڑی آسانی سے پہچان سکتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ فوراً اپنے کمرے میں جائیں اور لٹچ دیں مگھولیں۔ تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔“
 تھوڑی دیر کے بعد میں اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے پوچھا۔ ”تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟“

”صرف بالوں کی سفیدی سے عمر نہیں چھپ جاتی ہے۔“ میں کہنے لگا۔ ”آپ نے سفید بالوں کی وگ سے ساٹھ برس کی عورت کا بہرہ بھرا ہے اور چہرے میں تبدیلی کر لی ہے لیکن چہرے پر حکمن تک نہیں ہے۔ چال ہے ہاتھوں سے اور آنکھوں سے آپ ایک جوان عورت کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ادیس اب الحق کے آدمی آپ کو چند لمحے بغور دیکھنے کے بعد پہچان سکتے ہیں۔“

”میڈم! تھوڑی دیر پہلے تازہ ہلسا (پلا) مچھلی آئی تھی۔ وہ میں فرائی کروا کے لایا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”ہمارے ہاں کی فرائی مچھلی پورے دیں میں مشور ہے۔ پلیز آپ ٹیسٹ کر کے دیکھیں۔“

”ہلسا مچھلی؟“ عالیہ کے منہ میں پانی بھر آیا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف لپکی تو میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ عالیہ نے مجھے حیرت سے دیکھا تو میں نواٹک کے دروازے کی طرف لپکا اور اپنے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے نواٹک میں داخل ہو کر اس کا دروازہ اتنا کھلا رکھا کہ اس میں ایک بھری سی بن گئی اور وہ کھلا ہوا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس کی لائٹ کا سوچ آن نہیں کیا۔ فوراً ہی جیب سے اپنا ریو اور نکال لیا۔

عالیہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا ویسے ہی وہ فرش پر آری۔ کسی نے فوراً ہی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ داخل ہونے والے نے دروازہ اندر کی طرف پوری طاقت سے دھکیلا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنا توازن پر قرار نہ رکھ سکی تھی پھر وہ خوف زدہ لمبے میں بولی۔ ”دھو! تم؟“ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا لباس درست کرتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔

دھو اس تیزی سے عالیہ کی طرف بڑھا تھا کہ میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ ایک دراز قد اور بے حد صحت مند جسم کا مالک تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا پستول تھا۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ باہر نکل کر یا اندر سے ہی اس پر فائر کر دیتا۔ میں غار یوں بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے ریو اور میں سائیلنسر لگا ہوا نہیں تھا۔ فائرنگ کرنے سے ہنگامہ کھڑا ہونے کا خدشہ تھا میں چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے لاشی بھی نہیں ٹوٹے۔

”تم..... کس لئے آئے ہو؟“ عالیہ کی زبان لڑکھائی۔

اس نے کوئی جواب دینے بغیر ٹیپ اور پستول اس میز پر رکھ دیا جس پر کھانا پنا ہوا

غدا۔ دوسرے لمبے لمبے مجھے اس کے ہاتھ میں آٹھ انچ لمبے دو دھاری ہاتھ کی چمک نظر آئی۔ میں اس مسلک ہتھیار کو پہچانتا تھا۔ مجھے اس کا پھل زہر بھرا ہوا لگ رہا تھا۔

”دھو؟“ عالیہ کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ ”کیا تم مجھے بھی ذبح کرو گے؟“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے سرد اور سفاک لمبے میں جواب دیا۔ ”آپ کے شوہر کا یہی حکم ہے کہ میں آپ کو بھی روایتی انداز میں قتل کروں..... وہ آپ کا سر تن سے جدا دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”دھو..... دھو.....“ عالیہ گڑ گڑائی۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ”خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو..... میں تمہاری ہریات.....“ وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی اور غشیا کر فرش پر گر پڑی۔

دھو نے میز سے ٹیپ اٹھایا۔ اس میں سے دو تین انچ کا کھوکھلا کٹ کر عالیہ کی طرف بڑھا۔ وہ فرش پر اس کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گیا تاکہ اس کے منہ پر ٹیپ چپکا سکے۔ وہ جیسے ہی اس کے منہ پر ٹیپ چپکانے کے لئے جھکا میں نواٹک کا دروازہ کھول کر نکل آیا۔ مجھے اسی لمبے کا انتظار تھا۔ میں اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔ وہ میری آہٹ پا کر چو نکا اور لپٹ کر دیکھا میں نے اپنا ریو اور اس کے سر پر پوری قوت سے کھینچ مارا۔ ریو اور اس کی کھوپڑی پر لگا تو وہ اس کی ضرب نہ سہہ سکا۔ ایک دم پکڑا کر فرش پر گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور عالیہ کے قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے اپنا طمینان کرنے کے بعد اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے تھمہنے لگا۔ اسی وقت عالیہ کو ہوش آ گیا۔ اس نے اپنا سر جھٹک کر دھو کو بے ہوش اور مجھے اسے تھمہنے دیکھا تو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیوار کے سارے کھڑی ہو کر سر کے گمے سانس لینے لگی۔

”اف میرے خدا! کیا میں زندہ ہوں۔“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”کیا یہ

نصیحت مر گیا ہے؟“

”نہیں، بے ہوش ہو گیا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”میں نے ریو اور کا دستہ اس

”کیوں آخر؟“ وہ غصے سے بولی۔

میں نے عالیہ سے کہا۔ ”بس اب آپ چل پڑیں اپنا سامان لے لیں۔“

”کس بات کا شکریہ؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”میں نے ایک انسانی قرض ادا کیا ہے۔ اس میں شریعہ اور احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب ایک سپاہی میدانِ جنگ میں ملک اور قوم کے لئے لڑ سکتا ہے تو کیا وہ ایک جان نہیں بچا سکتا۔“

میں اتنا کہہ کر دروازے کے پاس پہنچا۔ دروازہ کھلا اور وہاں پر ہی تھی۔ میں نے عالیہ کو باہر آنے کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ لفٹ میں سوار ہو گئی تو میں نے لفٹ سے پیچھے آیا۔ پھر میں نے عالیہ کو اپنے آدمیوں کے ساتھ دیکھا۔ وہ پچھلی نشست پر بٹس ٹھسکر بیٹھ گئے تھے۔

★ ★ ★

میں رات دس بجے پوری تیاری سے ہوئی سے نکلا پھر ٹیکسی کر کے گھاٹ پہنچ گیا۔
در کشاپ اور اس کے باہر کھڑی ہوئی تمام لائیفیں اور موٹر بوئیں تاریکی میں ڈوبی
ہوئی تھیں۔ دفتر کے اندر دھیمی سی روشنی ہو رہی تھی۔ دربان شاید جاگ رہا تھا۔ میں
اندھیرے کی پناہ میں دفتر کی طرف بڑھنے لگا پھر میں قریب پہنچ کر ٹھٹک گیا اور جلدی سے
اپنے آپ کو ستون کی آڑ میں چھپا لیا۔ دفتر کے کمرے سے دو سائے باہر آئے تھے۔ دفتر
کی روشنی گل ہو گئی تھی اس میں ایک سایہ عورت کا تھا وہ کہہ رہی تھی۔ ”میرے گھر
چلو۔“

”رات کے وقت جانا مناسب نہیں ہے۔ صاحب کو یا مینجر کو پتا چل گیا تو میری نوکری کی خیر نہیں ہوگی۔“ دربان بولا۔

”کھٹے فیرہ کھٹے کی تو بات ہے۔“ وہ بولے۔ ”تمہارے پاس اتنی تیز رفتار موٹر بوئیں ہیں۔ کسی ایک میں چلتے ہیں صبح سے پہلے تو یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ ابھی تو گیارہ بجے ہیں تم ایک بجے واپس آ جاؤ۔“

”نوی! تم جب بھی آتی ہو اپنی بات منا کر رہتی ہو۔ چلو چلتا ہوں مجھے ایک بجے
واپس آنے دیا کہ کہہ دو مجھے بڑی سخت تاکید کی گئی ہے میں لانچوں کا خیال رکھوں۔ کہیں
ایسا نہ ہو کہ کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔“

پھر وہ دونوں ڈاک کے اس حصے کی طرف گئے جہاں موٹر بوٹیں بندھی ہوئی

نافٹوں کے ساتھ براجمان تھا" مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مٹھو مسکراہٹ بھر گئی۔ "ہیلو کیپٹن، صبور احمد اکمل سے تشریف آوری ہو رہی ہے۔"

"عالیہ کی تلاش میں گیا تھا۔" میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

"کیا اس کی تلاش میں سندور بن چلے گئے تھے؟" اس کے لمبے میں استہزائی انداز نا۔

"اے مصافحت میں تلاش کرتا رہا تھا شاید وہاں وہ کوئی مکان کرائے پر لے کر رہ رہی ہو۔"

"الحق آدمی وہ اسی ہوٹل میں اسی منزل پر کمرہ نمبر تین سو اکیاسی میں گھس رہی تھی۔" وہ تیز دم لہے میں بولا۔ "تم تین سو ساٹھ نمبر میں تھے، صرف تیس کمروں کا فرق نا۔ میرے ایک آدمی نے اسے شناخت کر لیا تھا مگر وہ اسے شدید زخمی کر کے فرار ہو گئی۔ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، کچھ پتا نہیں وہ بے ہوش پڑا ہوا ہے اس کے سر پر میں شاید اندرونی چوٹیں آئی ہیں۔ شاید اس نے اور اس کے آدمیوں نے اس کے سر پر کسی آہنی چیز سے ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ یعنی ایک طرح سے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ کب کا واقعہ ہے؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"آج دوپہر کا۔" اس نے جواب دیا۔ "جس وقت وہ اپنے کمرے میں لچ کر رہی تھی تب میرا آدمی اسے ختم کرنے گیا تھا۔ وہ مہربان بننے لگے کیلئے تو تب اس واقعے کا علم ہوا۔ تم اس وقت کہاں تھے؟"

"میں اپنے کمرے میں تھا اور مجھے اس واقعے کا کوئی علم نہیں شاید کسی مسافر کو بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوٹل کی انتظامیہ نے ہوٹل کی بدنامی کے خوف سے اس واقعے کو بڑی خاموشی سے دبا دیا۔ برابر والے کمرے میں رہنے والوں کو بھی پتا نہ چل سکا۔..... اس واقعے کی

تھیں۔ درہان نے ایک بڑی موٹر بوٹ کی رسی کھولی۔ اس میں دونوں سوار ہو گئے۔ درہان نے موٹر بوٹ کا انجن شارت کیا۔ جب موٹر بوٹ کافی دور نکل گئی تو میں تیزی سے لانچوں کی طرف لپکا۔ یہ مصلح اتفاق تھا کہ راستہ صاف مل گیا تھا۔ قدرت نے میری مدد کی تھی۔ سب سے آگے جولاچ تھی وہ مڑا تھی۔ میں نے جیب سے پشیل نارنج نکالی۔ اس کی مدد سے میں مڑے کے عرشے پر پہنچ گیا۔

عرشے سے نیچے آکر میں نے طاقتور برقی نارنج نکالی۔ اس کی روشنی میں، میں نے اس کا چاروں طرف سے جائزہ لینا شروع کیا۔ کوئی آدمے کھنڈے تک میں سرکھپا تا رہا۔ پھر سارے اسرار و رموز میرے دماغ میں آتے گئے۔ اس میں پوشیدہ مقام پر مسلمان کی مہنجائش پیدا کرنے کے لئے کام کر دیا گیا تھا۔ کسم والے چیکنگ کر کے ان جگہوں سے مسلمان کو نہیں نکال سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں اضافی ٹینک بھی تھے۔ اس کے علاوہ چاروں طرف سے ڈنل دیواریں اور ڈنل فرش اس طرح سے بنائے گئے تھے کہ اس کا پتا نہیں چلتا تھا۔ دیواروں کے درمیان میں بارہ انچ کا خلا سا لگتا تھا۔ فرش میں کتنا خلا تھا اس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی جستجو کے بعد مجھے خفیہ ٹینک نظر آگئے جو دیوار کیمر گھڑی کے پیچھے دیوار میں نصب تھے۔ ان میں دو بٹن تو دو دیواروں کے تھے اور ایک بٹن فرش کا تھا۔ دیواروں کے بٹن دہانے سے دیوار کوئی تین چار فٹ تک اوپر اٹھ جاتی تھی۔ ڈنل دیواروں کے درمیان جو خلا تھا وہ بارہ انچ کا نہ تھا بلکہ میں بائیس انچ کا ہو گا۔ اس میں آسانی سے اسلحہ رکھا جاسکتا تھا لیکن فرش میں یہ خلا کوئی دو فٹ کا تھا۔ دہری دیواروں کو اس خوبصورتی اور مہمات سے بنایا گیا تھا کہ کسم والوں کا خیال اس طرف جا نہیں سکتا تھا۔ ان تینوں لانچوں میں کسی ایک میں اسلحہ کی ایک پٹی بھی نہ تھی۔ چیکنگ کے فوراً بعد ہی اسلحہ کسی نامعلوم جگہ پر اکر دیا گیا تھا۔

میں واپس ہوٹل پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ٹھنک گیا۔ میرے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اور میں الحق اپنے دو

اس سے کہا کہ عالیہ کے بارے میں اطلاع دینے کے لئے اور یس الحق سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ چل مٹول سے کام لیتا رہا اور اس بات پر زور دیتا رہا کہ اسے بتا دیا جائے وہ خود اس کا پیغام پہنچا دے گا۔ میں بھی اڑ گیا کہ یہ بات پاس کے سوا میں کسی اور کو نہیں پاسکتا۔ اشد ضروری ہے۔ اگر اس نے پاس کی رہائش کا پتہ نہیں بتایا اور کل کوئی بات ہوئی تو وہ اس کا ذمہ دار خود ہو گا۔ تب کہیں جا کر وہ سیدھا ہوا۔ اس نے بتایا کہ اور یس الحق شکار کھینے کے لئے سندھ بن گیا ہوا ہے۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر بچے آیا اور کاؤنٹر پر کمرے کی چابی دے کر باہر آیا۔ کوئی فلائنگ بھریڈل چلا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی میرے تعاقب میں تو نہیں پھر میں نے ایک چوراہے سے ٹیکسی لی اور گھاٹ پہنچ گیا۔ عالیہ کے سینٹر جانے کے لئے موٹر بوٹ کی ضرورت تھی۔ واپسی کے لئے بھی۔ میں نے ایک مونو بوٹ کرائے پر لی اور عالیہ کے سینٹر پہنچ گیا۔

عالیہ اس وقت ایک عام قسم کی بوڑھی عورت کے بہروپ میں تھی۔ وہ کسی خادمہ کی طرح لگ رہی تھی۔ میں اسے پہچان نہ سکا اس نے یہ بہروپ بڑی مہارت سے بھرا ہوا تھا۔ آنکھوں میں اینس بھی لگا کر تھے۔

وہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔ ”کیا خبر ہے؟ تم نے رات ان لانچوں کو چیک کیا تھا؟“

”خبر تو بعد میں سناؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پہلے رات کی رپورٹ پیش کر دوں۔ میں نے تمام لانچوں کو اچھی طرح سے چیک کیا۔ ان خفیہ جگہوں کا پتا چلایا جس میں اسلحہ رکھ کر لایا جاتا ہے۔ ان میں اسلحہ نہیں تھا۔ کوئٹہ گارڈز کی چیکنگ کے فوراً ہی بعد انہیں کہیں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اب میں نے راز پایا ہے۔“

میں نے اسے تفصیل سے ان خفیہ جگہوں کے بارے میں بتا دیا۔ وہ یہ سن کر بھونچکی سی رہ گئی۔

تفصیلات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ تم اس عورت سے ایک بار ملنے اور اسے قریب سے دیکھنے کے باوجود بھی شناخت نہ کر سکتے مگر میرے آدمی نے اسے دیکھتے ہی شناخت کر لیا تھا۔ وہ کمپنی..... روز بروز ہماری راہ میں مشکلات پیدا کرتی جا رہی ہے۔ رات اس نے کوئٹہ گارڈز کو ہماری ان لانچوں کے بارے میں جھوٹی اطلاع دے دی کہ اس میں اسلحہ کی کھپ ہے جو چان پورٹ سے ایک غیر ملکی جہاز سے لائی جا رہی ہے۔ کوئٹہ گارڈز والوں نے لانچوں کے عمل کو بہت پریشان کیا..... اگر اسے فوراً ختم نہ کیا گیا تو وہ ہمارے لئے اور بھی سنگین خطروں بن سکتی ہے۔“

”مجھے وہ عورت ہوٹل میں دکھائی نہیں دی۔ ورنہ وہ میرے ہاتھ سے نہیں بچتی۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”وہ ایک بوڑھی عورت کے بہروپ میں تھی۔“ اور یس الحق چاٹ لیے میں بولا۔ ”میں تمہیں ایک ہفتے کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر تم نے اسے تلاش کر کے ختم نہیں کیا تو پھر تمہارے جرائم کی دستاویزات پولیس کے حوالے کر دی جائیں گی۔ میں اب تمہیں اس سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ عورت کسی زخمی ناکن کی طرح ڈسنے پر تلی گئی ہے۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھا تو اس کے پیچھے پیچھے اس کے دونوں آدمی کتوں کی طرح چل پڑے۔ ان کے باہر نکلنے ہی میں نے دروازہ بند کیا۔ تھوڑی دیر تک بستر پر بیٹھا اور یس الحق کی دھمکی پر غور کرتا رہا۔ اب وہ مجھے صرف ایک ہفتے کی مہلت دے گیا تھا مگر اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے وہ کب تک اپنی شہر میں موجود ہے۔ مجھے اس کی رہائش کا پتا چلنا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ چاکس طرح سے چلایا جا سکتا ہے۔

میں نے دوسرے دن صبح دس بجے اس کے درکشاپ ڈیزائن کو ٹیلی فون کیا اور اس سے رابطہ قائم ہونے پر اور یس الحق سے رات ہوٹل میں ہونے والی ملاقات کا ذکر کیا اور

خاتم شخص کا شکار کرنے جا رہا ہوں۔

سفر کے دوران میں بڑی سنجیدگی سے عالیہ کے بارے میں سوچا رہا۔ نہ جانے کیوں یہ عورت میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ جس طرح سے ندی کے دوپٹا ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے اسی طرح ہم بھی نہیں مل سکتے۔ سب سے بڑا فرق طبقاتی دیوار کا تھا۔ وہ ایک جہز کی بی بی نہیں تھی بلکہ ایک امیر کیرئیر ترین عورت تھی۔ میں اس کے خیال سے جتنا جان چھڑانے کی کوشش کرتا تھا وہ میرے تصور میں آکر کھڑی ہو جاتی تھی۔

میں اپنی جوانی کے دنوں میں چند دوستوں کے ہمراہ سیر و تفریح کے لئے سندربن دیکھنے گیا تھا۔ دھاکا سے کھانا کھانا دے دھاکا کا سنیر میں سفر کرتے وقت یہ جنگل آتا تھا۔ سنیر جنگل کے پاس سے ہی گزرتا تھا لیکن یہ رات کے وقت آتا تھا۔ گھمب اندھیرے میں یہ بہت خوفناک دکھائی دیتا تھا۔ درخت کالے دیوؤں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ چاندنی راتوں میں ایک عجیب سا منظر پیش کرتے تھے۔ مگر کبھی کناروں پر کوئی جانور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ بہت بڑا جنگل تھا۔ اس کا بہت بڑا حصہ بنگلہ دیش میں تھا۔ اس کا کچھ حصہ مغربی بنگال میں بھی تھا۔

تیز ترین لالچ نے دن دوپٹے سے پہلے ہی سندربن پہنچا دیا تھا۔ یہ ہرا بھرا اور بہت ہی گھنا جنگل تھا۔ میں نے اپنے طے میں تبدیلی کر رکھی تھی تاکہ ادریس الحق اور اس کے آدمی مجھے پہچان نہ سکیں۔ عالیہ کا سنیر مجھے ایک طرف اور ڈاک سے کچھ فاصلے پر کھڑا دکھائی دیا۔ دوسری طرف چھپائی لالچ بھی تھی جس میں ادریس الحق آیا تھا۔ سندربن جنگل میں شروع میں ریست ہاؤس اور دو تین ہوٹل تھے۔ اس کے علاوہ دکانیں بھی تھیں۔ یہ ہوٹل شکار کے سیزن کے موقع پر خوب چلتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں تاجروں کی آمد و رفت پورے سال رہتی تھی جو لکڑی اور بانسوں کے لئے آتے رہتے تھے۔

ریست ہاؤس میں کچھ کمرے خالی تھے اور وہ غیر ملکیوں کو دے دیئے گئے تھے مجھے

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پوچھا۔ ”کیا خبر لائے ہو؟“

”ادریس الحق سے رات میری ملاقات ہوئی تھی۔“ میں نے اسے ادریس الحق اور اپنے درمیان ہونے والی گفتگو سنانے کے بعد کہا۔ ”وہ شکار کے لئے سندربن گیا ہوا ہے۔“

”بہت خوب، بہت اچھی خبر ہے۔“ اس کا چہرہ دک اٹھا اور اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔ ”ہم بھی شکار کھینے چلیں گے۔ سب سے دلچسپ اور خطرناک شکار ادریس کا ہو گا۔“

”وہ اس قدر آسان شکار ثابت نہ ہو گا۔“ میں نے کہیں کہیں اشارہ کیا۔ ”وہ اکیلا ہے۔ اس کے ساتھ بہت سارے لوگ ہوں گے۔“

”مزا تو خطرناک شکار کھینے ہی میں ہے۔“ ادریس الحق نے بولی۔ ”اس کے ساتھ جتنے بد معاش ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ ہمارے ساتھ دس بارہ آدمی ہوں گے۔ یہ بھی تربیت یافتہ ہیں۔ اب مقابلہ دوید ہو گا۔“

عالیہ نے مجھے اپنے پاس کوئی تین گھنٹے تک روکے رکھا۔ اس دوران ہم نے مختلف منصوبے بنائے۔ آخر یہ طے پایا کہ وہ اس سنیر سے سندربن کل صبح روانہ ہو جائے گی میں دوسرے دن صبح مسافر لالچ سے ایک شکاری کے ہمیں میں علیہ بدل کر سندربن پہنچوں گا۔ پھر اس نے ایک جدید ترین امریکی خود کار رائل دی جس میں دو دین بھی نصب تھی۔ یہ رائل بہت دور تک مار کرنے والی تھی۔ اسے کھولا اور جوڑا جاسکتا تھا میں اسے کس میں رکھ کر ہوٹل لے آیا۔

عالیہ دوسرے دن علی الصباح سندربن روانہ ہو گئی۔ میں تیسرے دن، جس لالچ سے روانہ ہوا اس میں اور بھی شکاری سوار تھے۔ یہ غیر ملکی شکاری تھے۔ یہ شکار کا سیزن تھا ان دنوں حکومت کی طرف سے شکاری عام اجازت ہوتی تھی۔ غیر ملکی شکاریوں نے مجھے بھی شکاری سمجھا تھا انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میں جانوروں کا شکار کرنے نہیں بلکہ ایک

ایک ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لے لیا تھا۔ یہ کمرہ پہلی منزل پر ملا یہ ہوٹل لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ بہت صاف ستھرا تھا۔ میں نہا کر کھانا کھا چھل گیا تھا۔ میں نے اپنا وہ حلیہ بتایا جس میں آ رہا تھا۔ اس میں 'میں نے سفید فریج کٹ ڈاؤں کر ڈالا تھا۔ اس وجہ سے میرے ہاتھ میں بہت تبدیلی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے سفید براق پالوں کی دگ بھی پہن رکھی تھی۔

یہ بات میرے علم میں نہیں تھی کہ عالیہ اور ادریس الحق کہاں گھرے ہیں۔ جس وقت میں لان سے اتر رہا تھا تب میں نے کتوں کو عرش کے ریٹک کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔

میں رات کا کھانا کھانے کے لئے اپنے ہوٹل سے نکل کر ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھ گیا۔ ریسٹ ہاؤس میں کھانا بہت اچھا ہوا تھا۔ یہ بات مجھے لالچ کی کینٹین کے دہانے بتائی تھی۔ مجھے کھانے سے زیادہ عالیہ اور ادریس الحق سے دلچسپی تھی۔ میں ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میں ریسٹ ہاؤس ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی ٹھک گیا۔ ایک ناقابل یقین منظر دیکھ کر ہموں کا سہا ہو گیا۔ کھانے کی میز پر عالیہ اور ادریس الحق ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اس لمحے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میرا دل غ چکا کر رہ گیا۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کہیں یہ دونوں مل کر مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہیں؟ کیا ان میں آپس میں صلح ہو گئی ہے؟

پہلے تو میں سمجھا کہ نظر کا دھوکا ہے لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔ عالیہ بھی شکاریوں والے لباس میں تھی۔ وہ اپنی اچلی رنگت کی وجہ سے یورپی عورت کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے دل کو دلاسا دیا کہ شاید ان میں صلح ہو گئی ہے۔ ان کا آپس میں صلح ہو جانا میرے حق میں مفید تھا۔ نہ صرف میرے ہاتھ انسانی خون سے رنگنے سے بچ جاتے بلکہ مجھے میری دستاویزات بھی مل جاتیں۔ ان دونوں کے ملاپ سے میرے دل

نے ایک انجمن اسامہ صمدہ بھی محسوس کیا۔ ایک طرف خوشی ہو رہی تھی دوسرے طرف صمدہ صابھی ہو رہا تھا۔

”میرا کوئے والی میز خالی ہے۔“ ایک مستعد دھڑنے مجھے سوچ میں ڈوبا پا کر میرے پاس آ کر مجھے اشارے سے بتایا۔

ان کی میز کے پاس کوئی میز خالی نہ تھی۔ اگر ہوتی تو میں وہاں بیٹھ جاتا تاکہ ان کی باتیں سن سکوں۔ ان کے آس پاس کی تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ کسی میز پر ایک کرسی بھی خالی نہ تھی مجھے مجبوراً اس میز کی طرف جانا پڑا جو دہانے بتائی تھی۔ میں اس میز پر جا بیٹھا۔ یہ میز ایسی تھی کہ میں یہاں سے انہیں باتیں کرنا دیکھ سکتا تھا۔ دونوں کے چہروں کے تاثرات بھی۔ ان کے چہرے میری نظروں کی گرفت میں تھے۔

’وہ دونوں اس وقت خون کے پیاسے جانی دشمن نہیں بلکہ میاں بیوی کی طرح لگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے اور ادریس الحق کی آنکھوں میں محبت بھری تھی تو عالیہ کی آنکھوں سے خود سپردگی جھانک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سرفر تھی جس نے اسے اور حسین بنایا تھا۔ وہ چمک رہی تھی۔ ادریس الحق اس قدر سرشار دکھائی دے رہا تھا جیسے اس نے اپنی کوئی ہوئی منزل پائی ہو۔

وہ دونوں کوئی ایک گھنٹہ کے بعد اٹھے۔ کھانے کا بل ادریس الحق نے ادا کیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر نکلے کوئی نصف گھنٹے تک باہر چل تدری کرتے رہے تھے۔ میں برآمدے میں بیٹھا ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ میں نے کچھ فاصلے پر عالیہ اور ادریس الحق کے آدمیوں کو بھی مستعد پایا تھا۔ وہ بندو قوں سے مسلح تھے۔

عالیہ اس سے رخصت ہو کر اپنے آدمیوں کے ہمراہ اپنے سینٹر کی طرف بڑھ گئی اور ادریس الحق اپنے محافظوں کے ساتھ اپنی لاٹچ پر چلا گیا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد میں ڈاک پر پہنچا تاکہ عالیہ سے جا کر ملوں اور اس سے پوچھوں کہ کیا ان کے درمیان صلح مغلانی ہو گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر میں ادریس الحق کا خون نہیں کروں۔ کہیں ایسا نہ ہو

زندگی کے لئے میرے راستے کا پتھر ہٹ جائے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں تمہارا یہ چیلنج قبول کرتی ہوں۔ تم یہ شاید بھول رہے ہو کہ اونچا اڑنے والا قبر کی گہرائی میں جا کر تاکتا ہے۔“

”آپ ہوشیار ہیں۔ میں بھی آپ کی حفاظت کے لئے آس پاس موجود رہوں گا۔“

”کل صبح میں شکار پر جا رہی ہوں۔“ عالیہ بولی۔ ”ناشتے کے بعد نکلوں گی۔ ناشتہ ریسٹ ہاؤس میں کروں گی۔“

میں ناشتہ کرنے کے لئے ریسٹ ہاؤس پہنچا تو اس وقت نوج رہے تھے۔ ناشتے کی میز پر میں نے عالیہ اور ادریس الحتی کو دیکھا وہ دونوں آج پھر دشمنوں کی طرح نہیں بلکہ دوستوں کی طرح میاں بیوی کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ عالیہ نے جینز، فل بوٹ اور خالی رنگ کی آدمی آسٹینز والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے سر پر ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ گاؤں کی عالیہ بیگم سے یکسر مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ کرسی پر ان کی بندوقب‘‘ تھیلے‘‘ دور میں اور قبراس رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت ڈاننگ ہال میں اور بھی شکاری ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔

کوئی نصف گھنٹے کے بعد ایک ایک کر کے شکاری ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں آئے انہیں دہائیوں نے گھیر لیا جو جانور بیچنے کے لئے آئے تھے۔ غیر ملکی شکاریوں نے بغیر کسی مول تول کے جانور خرید لئے۔ ہم وطن مول تول کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد شکاری دو دو اور تین تین کے گروپ بنا کر مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ کچھ تو چھپوں میں چل پڑے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عالیہ‘ ادریس الحتی کے ہمراہ شمال کی جانب چل پڑی۔ اس جانب ہرن کا شکار کثرت سے ملتا تھا۔ ادریس الحتی کے ساتھ عالیہ کا جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ معلوم نہیں عالیہ کی کیا مصلحت تھی۔ اس نے کیا سوچا تھا۔ مجھے اس کی بے وقوفی پر سخت فصرہ آیا۔

کہ اس کا خون ہو جائے اور وہ مجھے قانون کے حوالے کر دے۔

ڈاک پر چھوٹی بڑی کشتیاں اور موٹر بوٹ بھی کھڑی تھیں۔ میں ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر چھپا ہوا عالیہ کے سینٹر پر پہنچا۔ کتوں نے مجھے دیکھتے ہی بھونکن شروع کر دیا تھا۔ صلح حافظہ جو کھانا کھا رہے تھے وہ دوڑے ہوئے آئے۔ مجھے اس محلے میں پہچان نہ سکے تھے۔ جب میں نے انہیں اپنی شناخت کرائی تب وہ مجھے اندر لے گئے۔

عالیہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو گئی۔ ”چھا تو یہ تم تھے؟ میں نے تمہیں ریسٹ ہاؤس کے ڈاننگ اور اس کے برآمدے میں بھی دیکھا تھا۔ تم نے ہم پر مسلسل نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ تم نے اتنا شاندار بہروپ بھرا ہوا ہے کہ میں بھی نہ پہچان سکی۔“

”میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا کیا وہ صحیح تھا؟“ میں نے کہا۔ ”اگر آپ دونوں میں صلح ہو گئی ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مبارک ہو۔“

”آجکے جو کچھ دیکھتی ہے وہ کبھی سچ نہیں ہوتا ہے۔ ہم دونوں کے درمیان صلح ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالفرض محال صلح ہو گئی ہوتی تو میں اپنے سینٹر پر واپس نہ آتی۔ اس کی لالچ پر چلی جاتی۔“

”میں نے اور دنیا والوں نے جو دیکھا کیا تھا؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”تم نے جو کچھ دیکھا وہ ایک دھوکا تھا۔ ایک فریب تھا۔ ایک اداکاری تھی دنیا والوں کو دکھانے کے لئے۔“ وہ سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی۔ ”دراصل ہم دونوں کے درمیان جو سرد جنگ جاری ہے اس کے بارے میں دنیا والے نہیں جانتے ہیں۔ نہ کسی کو پتا ہے۔ ہم دونوں اندر ہی اندر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ یہ ہم دونوں کی مجبوری ہے کہ ہم کھل کر لڑ نہیں سکتے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے مجھ سے کہا کہ عالیہ! اب تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاسکو گی۔ اب تم میرے چال میں پھنس چکی ہو تم ہوٹل میں مھل اتفاقہ پھنچ گئیں۔ یہاں میرے ساتھ کرانے کے قاتل آئے ہوئے ہیں۔ اب تمہاری ساری دولت، جائیداد اور زمینیں نہ صرف میری ہوں گی بلکہ ساری

میں غیر محسوس انداز سے درختوں کی آڑ میں ہوتا ہوا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے چلے لگا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ادریس الحق کا کوئی آدمی میرے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ کوئی نہیں تھا۔ ادریس الحق نے شاید اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا عالیہ کو ختم کرنے کا کیا منصوبہ تھا۔ میرے بہت سوچ بچار کرنے پر بھی ذہن میں نہیں آ سکا۔

کوئی دو تین فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جگہ جگہ پر چٹانیں بنی ہوئی تھیں۔ ادھر شیر اچھتے تیندوے اور شیر بھی نکل آتے تھے۔ عالیہ با ادریس الحق نے کوئی جانور نہیں خریدیا تھا۔ وہ دونوں ایک چٹان پر چڑھ گئے تو میں بھی ایک ایسی چٹان پر چڑھ گیا کہ جہاں سے ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھ سکوں۔ میری رائفل لوڈ تھی۔ میں دور میں سے انہیں دیکھنے لگا۔ ادریس الحق اور عالیہ دور میں سے مخالف سمت پر شکار دیکھ رہے تھے۔ مجھے بہت دور ایک دو ہرن قلا نہیں بھرتے ہوئے دکھائی دیے۔ سورج کی روشنی درختوں سے چھن رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ میں تمازت بالکل نہ تھی ہوا بھی بڑی فرحت بخش چل رہی تھی۔ چاروں طرف گمراستا طاری تھا اور بہت دور سے وقفے وقفے سے فائرنگ کی آواز تھوڑی دیر تک سنائی دیتی رہی تھی۔ میں کچا اور ہو شیرا تھا۔ مجھے اب لگ رہا تھا کہ کوئی منحوس واقعہ رونما ہونے والا ہے اور ادریس الحق نہ صرف شاطر اور کینہ خصلت تھا بلکہ بے رحم اور بے حد سفاک بھی تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہرن کا ایک بچہ کہیں سے قلا نہیں بھرتا ہوا ان کی چٹان سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گیا یہ بہت ہی چھوٹا اور پارسا بچہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی عالیہ اپنے آپ پر قابو نہ پاسکی۔ اسے پکڑنے کے لئے چٹان سے اتر کے اسے چمکارتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ اس نے اپنی بندوق چٹان پر ہی چھوڑ دی تھی۔ ہرن کے بچے نے اسے دیکھا تو وہ تھوڑی دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ عالیہ اس کی طرف غیر محسوس انداز سے بڑھنے لگی۔ وہ

ہرن کے بچے کے قریب پہنچی اور بجلی کی سی سرعت سے جھپٹ کر اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ بچہ گود میں سہا ہوا سالگ رہا تھا۔ عالیہ اسے پکار رہی تھی۔

جیسی بہت قریب سے بڑے زور کی شیر کی دھاڑ سنائی دی۔ عالیہ بچے کو گود میں لے کر چٹان کی طرف لپکی تھی کہ ایک دم سے ٹھٹک کے رک گئی۔ اس کے سامنے جنگل کا بادشاہ کھڑا ہوا تھا۔ عالیہ کی گود سے ہرن کا بچہ گرا، وہ سنہیل کر ایک سمت دوڑ گیا۔ شیر نے اس شکار کی طرف توجہ نہیں دی وہ عالیہ کو دیکھ کر دھاڑ رہا تھا۔ عالیہ دہشت سے تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ ادریس الحق نے شیر کو مارنے کے لئے اپنی بندوق سیدھی نہیں کی بلکہ وہ اسے استہزا کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

عالیہ کی موت کے لئے اسے ایک سنہرا موقع ملا تھا۔ وہ اسے شیر کا ترنوالہ بنا کر اپنے انتقام کی آرزو پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سفاک چمک اور چہرے پر درندگی چھائی ہوئی تھی۔ میں رائفل کی دو دھن سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی رائفل سے شیر کا نشانہ لیا۔ شیر اس پر حملہ کرنے کے لئے پر توں رہا تھا۔

پھر میں نے الہی بی پر دباؤ ڈال کر شیر پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ چند لمحوں کے بعد شیر زمین پر گرا پھر اس نے تڑپتے ہوئے دم توڑ دیا۔ اس کے زخموں سے رستا ہوا لہو زمین کو سرخ کرنے لگا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے ادریس الحق کی لپٹ اچھل پڑا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ فائرنگ کہاں سے ہوئی۔ اس لمحے میرے لئے بہترین موقع تھا ادریس الحق کو ختم کرنے کا۔ اس کے لئے صرف ایک گولی کافی تھی۔ مجھے اس سے اچھا موقع پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ اسے کس نے قتل کیا۔

میں نے ادریس الحق کی جانب رائفل کا رخ کر کے شست بانہی دو دھن کی مدد سے میں نے اسے نشانے کی زد میں لیا۔ میری نفرت عود کر آئی اور رگوں میں لمبا اٹھنے لگا۔ اس شخص نے مجھے کیسا ستایا تھا؟ مجھے ایک عورت کو قتل کرنے کے لئے بلیک میل

اور پھر یہ جگہ ایسا نہ تھی کوئی شخص غیر مسلح سیر و تفریح کے لئے نکل جائے۔ قریب میں ایک گاؤں تھا۔ گاؤں والے بھی اس طرف آتے تھے تو وہ مسلح ہوتے تھے۔ کیونکہ درندے اس طرف بھی آتے تھے۔

میں نے ایک لمبے کے ہزارویں حصے میں کچھ سوچ لیا تھا۔ میں تیزی سے لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ ایک دہائی اس سے منت سماجت کر رہا تھا کہ ایک بکری خریدے۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ ”میں نے پہلے ہی سے ایک بکری کا انتظام کر لیا ہے۔“

”سرا“ میں نے اور یس الحق کو مخاطب کیا۔

اور یس الحق نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے مجھے اس طے میں پہچانا نہیں تھا۔ وہ خشک لمبے میں بولا۔ ”کون ہو تم؟“

”یکیشن مبور احمد۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ بڑی طرح چونکا۔ ”میں نے شاید تمہیں کل دیکھا تھا۔ تم کب آئے؟ یہاں کس لئے آئے؟“

”عالیہ بیگم کی تلاش میں اور آپ کا حکم بھالانے کے لئے آیا ہوں۔“

”مگر تم نے کل مجھ سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا؟“ اس کا منہ بن گیا۔

”اس لئے کہ آپ بہت معروف تھے اور میں بھی بہت تھا کہ ہوا تھا اور پھر سارا دن

منصوبہ بنانا رہا تھا۔

”دیئے تم بہت اچھے موقع پر آئے ہو۔ مجھے ایک معتبر یعنی گواہ کی سخت ضرورت

تھی۔ میرے ساتھ چلو۔

”آج عالیہ بیگم دکھائی نہیں دے رہی ہیں؟ کبیں وہ واپس تو نہیں چلی گئی؟“

”وہ میرے قبضے میں ہے۔“ وہ استہزائی لمبے میں بولا۔ ”آج اس کی لاش ہی واپس

جائے گی۔“

ہے ان سے دنیا اور آخرت میں حساب لیتا ہے۔“

”میں اتنا چاہتی ہوں کہ یہاں سے وہ نہیں اس کی لاش جائے۔“

ہم نے کوئی چار گھنٹے سٹیئر پر گزارے اور ہم منصوبہ بناتے رہے۔ اس وقت ایک ایسے منصوبے کی ضرورت تھی کہ عالیہ پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ساپ بھی مرجائے لازمی بھی نہ ٹوٹے۔

میں ساری رات ایک منصوبہ ذہن میں پکاتا رہا تھا۔ اس لئے صبح بیدار ہوا تو دس بج رہے تھے۔ میں تیار ہو کر ریسٹ ہاؤس جانے کے بجائے سیدھا سٹیئر پر پہنچا تاکہ عالیہ کو یہ منصوبہ بتا سکوں۔ میرا خیال تھا کہ عالیہ ناشتہ کر کے واپس آچکی ہوگی۔ میں نے اسے شکار پر جانے سے منع کیا تھا۔ سٹیئر پر وہ موجود نہیں تھی۔ اس کے آدی سے معلوم ہوا کہ وہ صبح نو بجے ناشتہ کرنے جو گئی تھی اب تک واپس نہیں آئی ہے۔ فوراً ریسٹ ہاؤس پہنچا۔ اس کے ڈاٹنگ ہال میں عالیہ دکھائی نہیں دی۔ البتہ اور یس الحق موجود تھا۔ وہ چار پانچ شکاروں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے بلند آواز سے اپنے ساتھیوں سے کہا تاکہ ہال میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی سن لیں۔ ”میری بھادر بیگم میرے منع کرنے کے باوجود اکیلی ہی شہر کا شکار کرنے چلی گئی ہیں۔ مجھے اجازت دیں میں بھی چلوں۔ وہ کسی چٹان پر میرا بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں گی۔ گڈ بائی۔“

اتنا کہہ کر اس نے باری باری ہر ایک سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا پھر اس نے اپنا تھیلہ اٹھا کر کندھے پر لٹکایا۔ دو دین اٹھا کر گلے میں پکڑ لی۔ پھر اپنی بندوق اٹھا کر برآمدے کی طرف بڑھا۔

میرا ہاتھ خشک دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ عالیہ سٹیئر پر تھی نہ یہاں۔ میں نے اسے شکار پر اکیلے جانے سے منع کیا ہوا تھا۔ آج اس کا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنی بندوق بھی نہیں لی تھی۔ وہ صبح نو بجے یہاں ناشتہ کرنے کے لئے آئی تھی

عالیہ نے اس کے منہ پر ٹھوک دیا پھر وہ غصہ ناک ہو کر بولی۔ ”تم قانون قدرت کو بھول رہے ہو؟“

”قانون قدرت۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”تم قانون قدرت کے انتظار میں بیٹھی رہو۔ میں دیکھتا ہوں وہ تمہاری کیا مدد کرتا ہے؟“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”چلو ہم لوگ چل کر چنان پر بیٹھتے ہیں۔“ اس نے قریب بنی ہوئی چنان کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ کس لئے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لئے کہ کوئی شیر آجائے، پھر اسے چیر پھاڑ کے کھا جائے؟“ وہ سفاک لہجے میں بولا۔

”اگر شام تک کوئی شیر نہ آئے تو؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”چونکہ بہت سارے شکاری، شکار کے لئے نکلے ہوئے ہیں اس وجہ سے شاید کوئی شیر ادھر نہ آئے۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں کھول دیا جائے اور جنگل کے اندر تک لے جایا جائے پھر کوئی شیر شاید آ جائے۔ ایک دو گھنٹے میں کام تمام ہو جائے گا۔“ اسے میری تجویز بہت پسند آئی۔ اس کے کہنے پر میں نے رسی کھول کر عالیہ کو آزاد کر دیا۔ اس نے زمین پر سے عالیہ کی بندوق اٹھا لی تھی۔ ہم عالیہ کو جنگل کے اندر کی طرف لے جانے لگے پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی اور میں نے اسے یہ تجویز پیش کی کہ عالیہ کو اس طرح ساتھ لے کر پٹلے میں خنجر ہے۔ اس کے اور ہمارے درمیان میں تیس گز کا فاصلہ ہونا چاہئے۔ کسی درندے کے حملہ کرنے کی صورت میں یہ ہمارے پیچھے چھپ سکتی ہے۔ اس صورت میں ہم بھی درندے کے حملے سے بچ نہ سکیں گے۔

عالیہ ہم سے کوئی تیس گز کے فاصلے پر چل رہی تھی۔ پس دائیں جانب تھا اور

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر شال کی جانب تیزی سے چل پڑا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عالیہ کس طرح سے اس کے قبضے میں آ گئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید اس کے آدمیوں نے عالیہ کو اغوا کر کے جنگل میں رکھا ہوا تھا۔ اب وہ اس طرف جا رہا تھا۔

پھر ہم ایک جگہ رک گئے۔ عالیہ ایک درخت سے بندھ گئی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں کے پاس ایک بندوق پڑی ہوئی تھی۔ یہ بندوق عالیہ کی نہیں تھی۔ اور اس الحق کی تھی۔ اور اس الحق کے ہاتھ میں دسکی ہی ایک اور بندوق تھی۔ اور کوئی بھی نہ تھا ہم دونوں کے سوا۔

وہ عالیہ کے پاس جا کر متحضر آہیں لہجے میں بولا۔ ”حیرت کی بات ہے۔ تم اب تک زندہ ہو۔ کوئی درندہ ادھر نہیں آیا؟“

عالیہ بڑی دہشت زدہ سی ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر بھڑک اٹھی۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بزدل اور کینے ہو۔ ایک عورت سے کہیں اس طرح مقابلہ کیا جاتا ہے۔“

”تم نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے تم سے انتقام لینے کی اس سے اور کوئی بہتر صورت نہیں تھی کہ تمہیں شیر کا نوالہ بنا دیا جائے اس طرح بے میں قانون کے ہاتھوں سے بھی بیچ جاؤں گا۔“ اس نے بڑے بڑسکون لہجے میں جواب دیا۔

”قانون کے ہاتھوں سے کوئی نہیں بیچ سکا ہے، تم کیا بچو گے؟“ وہ پوچھ لاری۔

”قانون؟“ وہ ہنسا۔ ”قانون حکومت کا نہیں میرا چلتا ہے۔ قانون کے محافظ میری جیب میں ہیں۔ میرے خریدے ہوئے ہیں۔ میں بیس برس سے قانون کی مسلسل خلاف ورزی کر رہا ہوں۔ آج تک قانون میرا کچھ بگاڑ نہیں سکا۔ میں نے نہ جانے کتنے قتل کئے اور کرائے مگر مجھ پر آج نہ آسکی، تمہارے مرحلے سے میرا بال تک بچا نہیں ہو گا۔ پھر تمہاری ساری دولت اور جائیداد میرا تمام نقصان پورا کر دے گی۔“

”کیا؟“ میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ ”کیا میری خدمات کا یہی صلہ ہے؟“

”میں تمہیں تمہاری خدمات اور احسانوں کا بہت زبردست صلہ دینا چاہتی ہوں۔“

”بلیک میل کی صورت میں؟“

”ہاں یہ ہے کہ عورت چاہے کتنی بہادر، طاقتور اور دولت مند کیوں نہ ہو وہ ایک مرد کے سہارے کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔ اسے قدم قدم پر مرد کی رفاقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے اب تمہاری ضرورت ہے اور.....“ اس نے توقف کر کے اپنے پرس سے ایک تصویر نکالی اور میری طرف بڑھائی۔ ”اور اسے ایک باپ کی۔“

میں نے تصویر لے کر دیکھی۔ وہ پارو کی تصویر تھی۔

☆-----☆ ختم شد -----☆

ادریس الحق بے ایک بندوق میرے حوالے کر دی تھی۔ ہم عالیہ کو بندوق کی زد میں لے چل رہے تھے۔ نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ قریب سے غرائے کی آواز سنائی دی۔ ہم لوگ چونکا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے بندوق زمین پر رکھ کر انا نقل تان لی۔

ادریس الحق بھی بندوق تان کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ قریبی جمائواں میں سرسراہٹ ہوئی۔ ادھر ہی ادریس الحق کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہاں سے شیر نمودار ہوا اس نے ادریس الحق پر چھلانگ لگائی۔ ادریس الحق نے اس کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ اس میں سے گولی نہیں نکلی۔ کلک کی آواز نکل کر رہ گئی۔ اس نے دوبارہ ٹریگر دبایا۔ پھر کلک کی آواز ہوئی۔ دراصل غلطی سے اس کے ہاتھ میں خالی بندوق تھی۔ یہ وہ بندوق تھی جو عالیہ کے پیروں کے پاس پڑی تھی۔ بھری بندوق میرے پاس تھی۔ اسے تیسرا فائر کرنے کی لویت نہیں آئی شیر اس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔

جتنی دیر میں میں نے اپنا رانا نقل سے نشانہ لے کر شیر پر گولیاں برسائیں اتنی دیر میں شیر اسے ختم کر چکا تھا۔ اتفاق سے اس وقت شکاریوں کی جپ بھی آ نکلی تھی۔ عالیہ کے لئے اس نے گڑھا کھودا تھا۔ وہ خود گڑھے میں جا گرا تھا۔

☆-----☆

پولیس کو بیانات دینے اور رسمی کارروائی کرنے میں پورے تین گھنٹے لگ گئے ادھر عالیہ نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس کے لئے روٹ نامت ضروری تھا۔ اس نے رونے کی اداکاری بہت اچھی طرح کی۔ ادریس الحق کی لاش اس کی لالچ میں رکھی ہوئی تھی۔ ہم کھانا واپس جا رہے تھے۔

جب کھانا میل قریب آ رہا تھا تب میں اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تجیزو گھنٹین کے بعد مجھے میری تمام دستویزات ضرور واپس کر دیں تاکہ اب میں ایک پرسکون زندگی گزار سکوں۔“

”لیکن میں وہ دستویزات تمہیں لوٹاؤں گی۔“ وہ بخنڈی سی ہوئی۔